سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف ۱۹۸۲ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۳　ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۹ء　عدد ۶

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

معارف کے پاکستانی قدردانوں سے

پاکستان میں معارف کے قدردانوں کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ پاکستان میں معارف کی ترسیل کا انتظام ہو گیا ہے، اس لیے اس کا سالانہ چندہ مبلغ ۷۵ روپیے مندرجہ ذیل پتے پر بھیج کر ہمیں مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ معارف ان کی خدمت میں پہنچتا رہے گا۔ (منیجر)

حافظ محمد یحییٰ صاحب پہلی منزل، شیرستان بلڈنگ، بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج اسٹریچن روڈ

کراچی۔ پاکستان

فون: 217156 / 213052

شذرات

ملک میں ایک ذہنی وفکری انقلاب لانے کا عمل نہایت سرگرمی سے جاری ہے، تاکہ مسلمان اپنے عقیدہ ومذہب اور تہذیبی روایات سے بے گانہ ہوکر اکثریت کے اندر ضم ہوجائیں، مسلمانوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے اور ایک خاص مذہب وکلچر کو ان پر مسلط کرنے کے لیے تعلیم کا پورا ڈھانچہ تبدیل کیا جارہا ہے جس کے بعد ان کا قومی وملی تشخص اور امتیازی خصوصیت وحیثیت باقی نہیں رہ سکتی، اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے ہماری سیکولر اور جمہوری حکومت کی پوری مشینری حرکت میں رہتی ہے، اور آئے دن نت نئی ترکیبیں اور اسکیمیں ایجاد کرتی رہتی ہے، پرائمری اسکولوں سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں تک کا نصاب سیکولر رجحانات اور اتحاد ویکجہتی کو فروغ دینے والے محرکات سے خالی اور اسلام ومسلم دشمن مواد سے پُر ہے، حکومت کی ناوک فگنی سے مسلمانوں کے وہ ادارے بھی محفوظ نہیں ہیں جن کو انھوں نے خود اپنی محنت وجانفشانی سے قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے، حد یہ ہے کہ اترپردیش کی حکومت اسلامی مکاتب اور عربی مدارس کو نیبر ایکٹ اور دوسرے قوانین کا پابند کرکے اسلام کے ان مضبوط قلعوں کو مسمار کرنے پر تلی ہوئی ہے جبکہ ملک کے آئین نے اس کا پورا اختیار دیا ہے کہ اقلیتیں اپنی پسند کے ادارے قائم کریں، حکومت کے اس غیر آئینی وغیر جمہوری اقدام سے مسلمانوں کی تشویش واضطراب بالکل بجا ہے۔

دینی تعلیمی کونسل عرصہ دراز سے اترپردیش میں دینی تعلیم کو فروغ دینے کی جدوجہد میں مصروف ہے، اس کی بدولت پورے صوبہ میں آزاد وخود کفیل مکاتب کا جال بچھ گیا ہے، جو مسلمان بچوں کو سرکاری نصاب کے مسموم اور تباہ کن اثرات سے محفوظ رکھ کر انھیں دین وایمان اور عقیدۂ توحید ورسالت سے وابستہ کیے ہوئے ہیں، کونسل نے اس نازک موقع پر بھی اپنی ذمہ داری محسوس کی، اور موجودہ سنگین صورت حال سے پہلے حکومت کو باخبر کیا، مگر جب اس کے کان پر جوں نہ رینگی تو عام مسلمانوں کو مسئلہ کی نزاکت واہمیت سے آگاہ کرنے اور ان سے استصواب کے بعد لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے یکم و ۲ جون کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک کل ہند کنونشن کرنے کا فیصلہ کیا، مگر جمعیۃ علماء ہند نے کار خیر میں سبقت کی، اور اس کے زیر اہتمام ۲۰ مئی کو لکھنؤ ہی میں عربی مدارس کی ایک کانفرنس ہوئی، اس میں وزیر اعلیٰ مسٹر نرائن دت تیواری نے اعلان کیا کہ "دینی مدارس پر کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی، اور اس سلسلہ میں کوئی نوٹیفکیشن اگر ہے تو اس کو منسوخ اور کالعدم سمجھا جائے" ان کے اس اعلان سے عام مسلمانوں کو خوشی ہوئی، مولانا اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند نے

ان کا شکریہ ادا کیا، اور خبروں کے مطابق دینی تعلیمی کونسل کے کنونشن نے بھی وزیر اعلیٰ کی کارروائی کا خیر مقدم کیا۔

وزیر اعلیٰ نے بتایا کہ ۸۳ء میں جب متعلقہ حکام نے دونوں نوٹیفکیشن جاری کیے تو نہ وہ وزیر اعلیٰ تھے اور نہ اس کا پتہ اس وقت کی کابینہ کے ارکان کو تھا، اور اب ۸۹ء میں جب انھیں نافذ کرنے کا عمل شروع ہوا تو انھیں اور ان کی کابینہ کو اس کا علم نہیں ہوسکا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اس اعلان کے بعد بھی یہ گنجایش باقی ہے کہ متعلقہ حکام آیندہ پھر اقلیتوں کو بے چینی اور اضطراب میں مبتلا کردینے والا نوٹیفکیشن جاری کرسکتے ہیں، غالباً اسی اندیشہ کی وجہ سے وزیر اعلیٰ نے اس کی خلاف ورزی کرنے والے افسروں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی ہدایت دی ہے، دراصل وزیر اعلیٰ کو افسروں کے لیے کسی گنجایش کا امکان ہی ختم کردینا چاہیے تھا، تاکہ دینی ادارے ہمیشہ کے لیے کم سے کم اجرت قانون اور بچوں اور عورتوں کے اداروں کے کنٹرول ایکٹ اور دوسرے خطرات کی زد سے محفوظ ہوجاتے، اس کمی کی بنا پر دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام بھی پروگرام کے مطابق کنونشن ہوا، اور اس میں اس کے علاوہ درسی کتابوں کی اصلاح اور نصاب میں اردو کی گنجایش نکالنے والے مسائل زیر بحث آئے، اس کنونشن میں شرکا کی تعداد زیادہ تھی، جو مسلمانوں کے مختلف طبقۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں مدارس کی گذشتہ اور موجودہ خدمات نیز ان کے امتیازات وخصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور حکومت پر زور دیا کہ وہ مدارس میں مداخلت کرنے کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرے، کیونکہ وہ ملک میں غیر پیشہ ورانہ طور پر علم وثقافت کی ترویج کرکے اسے اچھے اور صاحب کردار شہری مہیا کرتے ہیں، انھوں نے مدارس کو سرکاری الحاق اور سرکاری امداد قبول کرنے کے خطرات سے آگاہ کیا، جناب سید حامد نے کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے مدارس کو اپنی حالت بہتر بنانے اور اپنے نصاب کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا مشورہ دیا، مولانا علی میاں کے بقول اخلاص، ایثار، قربانی اور قناعت دینی مدارس کی اصل روح ہے لیکن حقائق اور زندگی کی طبعی بلکہ شرعی ضرورتوں سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی، پہلی بات عربی مدارس کے اساتذہ اور دوسری ان کے منتظمین کے لیے بہت قابل غور ہے۔

ہندوستان میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب طب یونانی کا چراغ مخالف ہواؤں میں بھی روشن کیے ہوئے ہیں جس کی لو ان کی مساعی جمیلہ سے روز بروز تیز ہورہی ہے، یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ دلی کا مشہور طب یونانی کا دواخانہ

"ھمدرد" ایک وقف ہے، جس کے وہ واقف متولی ہیں، دواخانے کا تمام منافع "ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن" کے ذریعہ کئی مختلف تحقیقی و تعلیمی اداروں اور مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، ۹۲ ایکڑ زمین پر دلی کے جنوب میں تغلق آباد میں ہمدرد نگر کے خوبصورت اور آراستہ کیمپس میں طب یونانی کا ریسرچ ادارہ، اسلامک اسٹڈیز کا انسٹی ٹیوٹ، فارمیسی کالج، طبیہ کالج، مجیدیہ ہسپتال، اعلا طرز کا کنونشن ہال، ہوسٹل، نرسنگ اسکول، مہمان خانہ، اسٹاف کوارٹرس، خوبصورت طرز کی مسجد کی عمارتیں ہیں، اداروں میں اعلیٰ سطح کا ریسرچ اور تعلیمی کام عرصہ سے جاری ہے، اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے ان اداروں کو مجموعی حیثیت سے "جامعہ ہمدرد" کے نام سے ایک یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے، ہم جناب حکیم عبدالحمید صاحب کو اس پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ کسی فرد واحد کی ایسی کامیاب کوشش کی مثال ملک بھر میں نہیں ملے گی، اب جامعہ ہمدرد دلی یونیورسٹی سے الگ ہو کر اپنی ڈگری عطا کرے گی، دعا ہے کہ اس کا بنیادی تاریخی کردار ہمیشہ قائم رہے اور ملک و ملت کو اس سے خاطر خواہ فیض پہونچتا رہے۔ آمین !!

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ اسلامی جمہوریۂ ایران کے بانی علامہ آیت اللہ روح اللہ خمینی کے انتقال کی خبر ملی، وہ اسلامی نظام کے علمبردار ہونے کی بنا پر قید اور جلاوطن کیے گئے، ایران سے شہنشاہیت کا خاتمہ اور جمہوریت کا قیام نیز اسے مغربی ملکوں کی گرفت سے نکال کر اسلام کے راستہ پر ڈال دینا ان کا اہم کارنامہ ہے، اپنی آخری وصیت میں انھوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو امریکی و روسی تسلط سے چھٹکارا حاصل کرکے، باہم متحد ہونے، اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنے اور زبان و رنگ و نسل کو چھوڑ کر اخوت اسلامی کے رشتہ میں منسلک ہو جانے کی دعوت دی ہے، مگر اسلامی انقلاب کے بعد ایران میں خون خرابہ ہوا، عراق سے آٹھ برس تک جنگ ہوتی رہی، حرم میں شورش برپا ہوئی، اس لیے ایران کے انقلاب کو نسلی و قومی سمجھا جانے لگا، مگر انھوں نے امریکی سفارتخانہ کو یرغمال بنانے کا اعلان کرکے ساری دنیا کو دم بخود کر دیا۔

سلمان رشدی کے قتل کے فتوے سے وہ عام مسلمانوں میں بہت محبوب ہو گئے تھے، ایرانی انقلاب نے پھر ثابت کر دیا کہ علما اور مذہبی رہنما بھی قوموں کی تاریخ موڑ دینے کا کام انجام دیتے رہے ہیں، آج اسلامی ممالک مغربی حکومتوں کی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں، لیکن مرحوم خمینی کی جڑیں عوام میں بہت گہری تھیں، اس لیے بڑی طاقتیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں، وہ انقلاب کے روز ہی کی طرح وفات کے دن تک عوام میں مقبول رہے، ان کی وفات بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف کرے، اور مرحوم کی مغفرت فرمائے !!

مقالات

ہندوستان میں علوم قرآنی کا نشو و نما اور اسلامی معاشرہ پر اس کا اثر

از پروفیسر خلیق احمد نظامی

"یہ عالمانہ مقالہ وہ توسیعی خطبہ ہے جو ۶ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی صدارت میں پڑھا گیا، اس موقع پر دار العلوم کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ لکھنؤ اور ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے منتخب فضلاء اور اہل علم بھی موجود تھے، اب فاضل مقالہ نگار نے اس کو مزید حک و اضافہ کے بعد معارف میں اشاعت کیلئے مرحمت فرمایا ہے، جس کے لیے ہم ان کے بہت ممنون ہیں، معارف کے صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے پورا مقالہ ایک ہی شمارہ میں شائع نہ کرنے پر ہمیں دکھ ہو رہا ہے۔" (معارف)

"اسلامی علوم" اور "اسلامی معاشرہ" کا رشتہ کچھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ علوم اسلامی کے متعلق کوئی گفتگو اس وقت تک معنی خیز نہیں ہو سکتی جب تک ان دونوں کے عمل اور ردعمل کے خاموش اشاروں پر نظر نہ ہو، علوم اسلامی سے اسلامی معاشرہ کا مزاج بنتا تھا،

اور معاشرہ اسلامی علوم کی جہد رسی کا رخ متعین کرتا تھا، یہ دونوں متوازی چلتے تھے، اگر کبھی اس رشتہ کی کڑیاں کمزور پڑنے لگتی تھیں تو ذہنی اور سماجی زندگی پر اضمحلال اور پژمردگی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، اور پھر تجدید و احیاء کی تحریکیں ابھر کر اس رشتہ اور توازن کو بحال کرتی تھیں، ہندوستان کی تاریخ میں علوم اسلامی کا ارتقاء مسلمان معاشرہ کی ضروریات کی عکاسی کرتا ہے، اگر کسی دور میں علوم اسلامی کے کسی خاص شعبہ پر زور دیا گیا ہے تو اس کے پیچھے سماجی تقاضوں کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے، مثلاً چودہویں اور سترہویں صدی میں فقہ اور علوم فقہ پر خصوصی توجہ، یا سولہویں اور اٹھارہویں صدی میں حدیث اور علوم حدیث کا غیر معمولی چرچا اس عہد کی سماجی ضروریات اور ملی کیفیات کا ترجمان ہے، چودہویں صدی میں جب "انا الحق" کی صداؤں سے فضا پرجوش ہونے لگی، جب اباحتی فرقے سر اٹھانے لگے، جب شریعت و سنت سے طریقت و حقیقت کے نام پر بے توجہی برتی جانے لگی، اور فکر کی گمراہی اس حد کو پہونچ گئی جس کی تفصیل خود فیروز شاہ کی تصنیف "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں ملتی ہے، تو اسلامی زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے باخبر کرنے اور بدعات و احداث کا سدباب کرنے کے لیے فتاوائے تاتارخانیہ، فقہ فیروز شاہی، فتاوائے فیروز شاہی، فوائد فیروز شاہی کی تدوین عمل میں آئی، جب سترہویں صدی میں وحدت الوجود کی تعلیم نے جو سرمد اور ملا شاہ وغیرہ کے ذریعہ عام ہو چکی تھی، عقائد کی بنیادوں کو متاثر کیا اور سنت و شریعت سے بے اعتنائی بڑھی تو "فتاوائے عالمگیری" کی تدوین کے ذریعہ ان رجحانات پر بند باندھے گئے، اکبر کے زمانے میں مذہبی فکر جس طرح مجروح ہو چکی تھی اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے شرح "اشعۃ اللمعات" لکھی، اور "مشکوٰۃ" کو اسلامی سیرت کی تعمیر میں موثر سمجھ کر اس کی تعلیم کو

عام کر دیا، پھر جب شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے علوم دینی کا چرچا کیا تو دو حقیقتیں ان کے پیش نظر تھیں: (۱) ایک طرف وہ نئی دنیا جو اپنے نئے مسائل کے ساتھ ابھر رہی تھی اور ایک نئے علم کلام اور نئے اجتہادی پیمانوں کا مطالبہ کر رہی تھی، دوسری طرف اسلام کی بنیادی تعلیم سے دوری اور بے تعلقی جو دن بدن بڑھنے پر تھی، قلب میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر رہی تھی، شاہ ولی اللہؒ نے ایک طرف "موطا" کو اپنی محدثانہ کوششوں کا مرکز بنایا تاکہ اس عربی روح سے جو امام مالکؒ کے یہاں نظر آتی ہے نئے حالات میں روشنی حاصل کی جا سکے، دوسری طرف انھوں نے کلام پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا، تاکہ مسلم عوام، بالخصوص اہل حرفہ، تاجر اور سپاہی، جو اسلامی تعلیم سے نابلد ہوتے جا رہے تھے، وہ روح اسلامی سے قریب آ سکیں، اور "اندرونی بے نیشی" کو ختم کیا جا سکے، ان کا یقین تھا کہ اگر مسلمان قرآن کو ایک زندہ حقیقت سمجھ کر اپنی ..... زندگی کا جزو بنالیں

تو پھر وہ ؏ نہ سیہ روز رہے پھر، نہ سیہ کار رہے۔

اس ضمن میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے، ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا یہ راز بڑا حیرت انگیز ہے کہ زوال و انحطاط کا زمانہ سب سے زیادہ عظیم الشان علمی کارناموں کا زمانہ رہا ہے، جوں جوں ذہنی کشمکش بڑھتی گئی ہے، جیسے جیسے زوال کے بادل امنڈ کر آئے ہیں، حساس زندگیاں عزم و ہمت کے ساتھ فکر و نظر کی نئی دنیا آباد کرنے میں لگ گئی ہیں، اور ان کی تحقیقات علمی نے عروق مردہ میں خون زندگی دوڑا دیا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے بیشتر علمی کارنامے کشمکش انحطاط اور انتشار کے دور سے تعلق رکھتے ہیں، تصوف کی سب سے پہلی فارسی کتاب "کشف المحجوب" جو شیخ نظام الدینؒ اولیاء کی نظر میں ایک مکمل مرشد کا درجہ رکھتی ہے اس وقت لکھی گئی تھی جب شیخ ہجویریؒ بقول خود "ناجنسوں" میں گرفتار تھے، اور غزنی بر

اخلاقی مُردنی چھائی ہوئی تھی، مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحبِ "مشارق الانوار" نے اس طرح حدیث کے درس دیے تھے کہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں صرف لباس بدل کر نقل و حرکت کر سکتے تھے، حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوبات جس ذہنی ماحول میں لکھے ہیں اس کا اندازہ ان کے نقل کیے ہوئے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّہَا   صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

ترجمہ: مجھ پر ایسے مصائب ٹوٹے ہیں کہ اگر وہ دِنوں پر ٹوٹتے تو وہ دن راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔

شاہ ولی اللہؒ کی "حجۃ اللہ البالغہ" اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب ان کی کیفیت یہ تھی کہ آسمان کے ستارے ان کو ناگوں کی آنکھیں اور بچھوؤں کے سر معلوم ہوتے تھے

کانّ نجومًا اومضت فی الغیاھب ؛ عیون الأفاعی او رؤوس العقاوب

ترجمہ: تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں، یا بچھوؤں کے سر ہیں۔

اِن روح فرسا حالات میں انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں تجدید و احیائے دعوت و عزیمت میں لگا دیں، نتیجہ میں وہ دینی لٹریچر وجود میں آیا جس پر مسلمانانِ ہند بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

علم | غالبًا اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے حصولِ علم کی کوشش کو ایک دینی اہمیت دے دی ہے، قرآن کریم میں سب سے پہلے "قلم" اور "کتاب" کا ذکر ہے، اور یہ پوچھنے کے بعد کہ

قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ	کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو

یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ	نہیں رکھتے، دونوں برابر
(زمر : ۹)	ہو سکتے ہیں؟

اعلان کیا گیا ہے:

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے
مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ	ہیں، اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا
دَرَجٰتٍ۔ (مجادلہ : ۱۱)	ان کے درجے بلند کرے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو مسلمان کا گم شدہ سرمایہ قرار دیا ہے: الحکمۃ ضالۃ المؤمن من حیث وجدھا جذبھا، اور نصیحت فرمائی ہے:

العلم حیاۃ الإسلام و	علم اسلام کی جان اور دین کا ستون
عماد الدین، العلم	ہے، علم زمین پر خدا کی قدرت ہے،
سلطان اللہ فی الأرض	جو اس سے مقابل ہوا تباہ
فمن وقع فیہ فقد ھلك	ہوا۔

جو علم عقل کو تابع فرمان نظر نہ کر سکے، جو علم خالق کائنات کی طرف رہبری نہ کر سکے، جو علم انسان کو عملًا "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" کا آئینہ دار نہ بنا سکے وہ علم جہل سے زیادہ مذموم و مردود ہے، اقبالؒ نے ایک جگہ لکھا ہے: "علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے، اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے" (ایس بولہب راحید رگرار کن، Educational Philosophy of Iqbal, P. 116)

مولانا رومؒ نے اسلامی نظریۂ علم کو ایک شعر میں پیش کر دیا ہے: ؎

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر جان زنی یارے بود

تاریخ یہ واقعہ بھلا نہیں سکتی کہ بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ قائم ہوا، اور وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے بڑے بڑے مشاہرے اور سامان آسایش مہیا کیے گئے تو بخارا کے علماء نے مجلس ماتم منعقد کی اور رو رو کر کہا کہ اب علم، علم کی خاطر نہیں بلکہ حشمت و جاہ کی خاطر حاصل کیا جائے گا، علم کو جو درجہ اسلامی معاشرہ میں دیا گیا وہ تاریخ عالم میں فقید المثال ہے۔

سماج اور علم

علم کا نشو و نما، انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں لکھتے ہیں: "نزول قرآن سے مقصودِ اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے" (اردو ترجمہ ص ۵)، پھر علم انفرادی زندگی سے کس طرح اجتماعی زندگی میں منتقل ہو کر ایک بہتر معاشرہ کی داغ بیل ڈالتا ہے، "حجۃ اللہ البالغۃ" میں شاہ صاحبؒ نے اسی پہلو سے پورے مسئلہ کو دیکھا ہے، اور انفرادی صلاحیتوں کے سماج پر اثرات کا جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ افراد کی اصلاح حقیقۃً معاشرہ کی اصلاح ہے، جب تک انسانی صلاحیتوں کو اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کی چاکری میں نہ لگا دیا جائے، علم کا حقیقی مقصد پورا نہیں ہوتا، اسی سے وہ قوت ہاتھ آتی ہے جو سماج کو مقصد حیات بتا کر فوز و کامرانی کی راہ پر چلا سکتی ہے، علم ایک سماجی ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنا انفرادی فرض ہے، اسلام نے علم سے آدم گری کا کام لیا ہے، مغرب کی طرح آئینہ سازی کا نہیں۔

ہندوستان میں علوم اسلامی کا ارتقاء

ہندوستان میں علوم اسلامی کا ارتقاء اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، یہاں کے دینی ادب کو معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے، تاریخ میں کم از کم دو موقعے ایسے آئے جب ہندوستان کو تمام اسلامی دنیا میں علوم اسلامی کی سربراہی کا شرف حاصل ہو گیا، ترکان غز اور منگولوں کے

حملوں اور سقوطِ بغداد کے بعد اسلامی دنیا کا علمی مرکز نقل دہلی کو منتقل ہوا، اور علوم اسلامی کے تحفظ اور ان کی نشر و اشاعت کا کام ہندوستان کے مقدر میں لکھا گیا، دوسرا دور وہ تھا جب اٹھارہویں صدی کے ہندوستان نے علم حدیث کا چرچا کیا، یہ خاندان ولی اللٰہی کا فیض تھا، مولانا سید رشید رضا نے "مفتاح کنوز السنۃ" کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہندی علماء نے علم حدیث کو نئی زندگی بخشی، ہندوستان میں علوم اسلامی کے نشو و نما کو سمجھنے کیلیے بعض حقائق کا پیش نظر ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان سے مسلمانوں کا پہلا تعلق ساحلی علاقوں کے ذریعہ قائم ہوا تھا، چنانچہ بہت سے محدثین کا ان علاقوں میں پہونچ جانا بعید از قیاس نہیں، مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم نے "یاد ایام" میں ان محدثین کا ذکر کیا ہے جو گجرات اور ساحلی علاقوں میں آکر آباد ہو گئے تھے، بعد کو تو یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ شیخ الاسلام زکریاؒ، شمس الدین سخاویؒ، اور علامہ ابن حجر مکیؒ کے تلامذہ نے درسِ حدیث کی سیکڑوں مسندیں وہاں بچھا دیں۔

۷۱۲-۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے سندھ پر عرب حکومت کا پرچم لہرایا، یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں کا سیاسی اقتدار ...... نصف النہار پر تھا، ایک طرف اسپین ان کے زیر نگیں تھا، دوسری طرف وسط ایشیا میں ان کا سیاسی تسلط قائم ہو رہا تھا، علوم اسلامی کے لیے یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا، کوفہ اور بصرہ علوم اسلامی کے مرکز بن کر ابھرے اور وہاں کا ہر گھر حدیث و روایت کی درسگاہ بن گیا، ممکن نہ تھا کہ ان دینی تحریکوں اور علمی جد و جہد کی صدائے بازگشت سندھ میں نہ سنائی دے، چنانچہ یہاں کے شہر منصورہ اور دیبل وغیرہ میں علوم اسلامی کا چرچا شروع ہو گیا، علامہ سمعانی نے "کتاب الانساب" میں بہت سے ایسے علماء و محدثین کا ذکر کیا ہے جن کی نسبت وطنی سندھ کے مشہور شہروں کی طرف ہے

ابو القاسم مقدسی دسویں صدی عیسوی میں جب ہندوستان آیا تو علماء و محدثین کی ایک کثیر جماعت کو درس و تدریس میں مصروف پایا، عربوں نے سندھ میں جو علمی فضا پیدا کردی تھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ سندھ سے اسلامی علوم کا قافلہ ملک کے دوسرے حصوں میں نہ جاسکا، مسلمانوں کے جو دینی علوم ہندوستان آئے وہ براہ راست عرب سے نہیں آئے بلکہ عجمی ممالک میں طویل سفر طے کرنے کے بعد یہاں پہونچے۔

جس وقت غزنویوں نے پنجاب پر اپنا تسلط قائم کیا تھا، اس وقت بیشتر اسلامی علوم بالخصوص تفسیر، حدیث، فقہ پوری طرح نشو ونما پاچکے تھے، حدیث کی کتابوں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن نسائی کے جمع کرنے والے بخارا، نیشاپور، بصرہ، ترمذ اور قزوین کے باشندے تھے، قرآن پاک کی مشہور تفسیر "کشاف" کے مصنف ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری (۱۰۷۵ - ۱۱۴۴) خوارزم کے رہنے والے تھے، غزنہ میں یہ تمام علوم پوری طرح متعارف تھے، اس لیے کہ اس وقت غزنہ کی حیثیت عروس البلاد کی تھی، ابن الاثیر، ابن جوزی وغیرہ نے لکھا ہے کہ محمود جس ملک کو فتح کرتا وہاں کے کتب خانے غزنہ کو منتقل کردیتا تھا، ممکن نہ تھا کہ غزنہ کی علمی اور ادبی تحریکوں اور رجحانات سے ہندوستان ناآشنا رہتا۔

شمالی ہندوستان پر غوریوں کے اقتدار اور سلطنت دہلی کے قیام سے پہلے مسلمانوں کی نوآبادیاں اجمیر، قنوج، بنارس، بدایوں وغیرہ میں قائم ہوچکی تھیں، جس وقت سلطنت دہلی کی بنیاد رکھی جارہی تھی، ترکان غز اور منگول وسط ایشیا میں مسلمانوں کے علمی اور تہذیبی اداروں کو تباہ و برباد کرنے میں مصروف تھے، ان حالات میں علماء و فضلاء کی کثیر تعداد نے اپنے

وطن کو خیرباد کہا اور ہندوستان کا رُخ کیا، اس طرح اسلامی ہند کو اپنے ابتدائی دور میں علماء و مشائخ کی ایک ایسی جماعت میسر آگئی جس نے چپے چپے پر اسلامی علوم کے پودے نصب کردیے، اس قافلہ کا جو شخص جہاں بیٹھ گیا وہاں علم و عرفان کا ایک مرکز اُبھر آیا، دہلی کے متعلق عصامی لکھتا ہے ؎

دراں شہر یک رونقے شدید — بلے لذت باشد اندر جدید

بسے سیدان صحیح النسب — رسیدند دروے ز ملک عرب

بسے کاسبان خراساں زمیں — بسے نقشبندان اقلیم چین

بسے عالمان بخارا نژاد — بسے زاہد و عابد از ہر بلاد

ز ہر ملک وز ہر جنس صنعت گراں — ز ہر شہر و ہر اصل سیمیں براں

بسے ناقدان جواہر شناس — جواہر فروشان برون از قیاس

حکیمان یوناں، طبیبان روم — بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم

دراں شہر فرخندہ جمع آمدند — چو پروانہ بر نور شمع آمدند[1]

یہ حرکت صرف انسانوں کی نہ تھی، علم و ادب، مذہبی افکار و رجحانات کے قافلے بھی جلو میں چل رہے تھے، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں دہلی میں ایسے علماء اور ماہرین فن موجود تھے کہ بخارا، سمرقند، بغداد، مصر وغیرہ میں بھی اس پایے کے علماء کا ملنا مشکل تھا، تفسیر، فقہ، اصول دین، نحو، لغت، بیان، کلام، منطق، غرض ہر فن کے ماہر یہاں موجود تھے، حد یہ ہے کہ بخارا، سمرقند، خوارزم اور عراق کے علماء کی تصانیف اس وقت معتبر سمجھی جاتی تھیں، جب ہندوستان کے علماء ان پر مہر توثیق ثبت

[1] فتوح السلاطین ۱۰۹-۱۱۰۔

کر دیتے تھے، ہندوستان میں علوم اسلامی کی عظمت کا ایسا دور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

صبح الاعشیٰ کے مصنف کا بیان ہے کہ محمد بن تغلق کے زمانے میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، عہد فیروزی میں ایک مدرسہ کا حال جس کو فیروز شاہ نے قائم کیا تھا، مطہر اس طرح لکھتا ہے:

عالمان عربی لفظ و عراقی دانش — ہمہ در جبہ شامی و بہ مصری دستار
ہر یکے نادرۂ دہر در انواع ہنر — ہر یکے واسطۂ عقل در اطراف دیار
در فقاہت بخارا و سمرقند نشاں — در بلاغت بحجاز و یمن و نجد و منار
صدر آں محفل و سر دفتر آں استادے — کہ ز سر تا بقدم صورت عقل ست و وقار
راوی ہفت قراءت، چاردہ علم — شارح پنج سنن مفتی مذہب ہر چار
پس شنیدیم ز گفتارش انواع علوم — اخذ کردیم ز تفسیر و اصول و اخبار[1]

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلاطین کے قائم کیے ہوئے مدارس نے بھی علوم و آداب کی ترقی میں گراں قدر حصہ لیا ہے، لیکن اگر تاریخی حقائق پر نظر ہو تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بادشاہوں کے قائم کیے ہوئے یہ مدارس علم کی ترویج و اشاعت میں وہ کام انجام نہ دے سکے جو بوریہ نشین، فقر و فاقہ میں زندگی گذارنے والے، غربت و افلاس سے خستہ جان علماء نے انجام دیا، اور اسلامی علوم کے اثر و نفوذ کا دائرہ شہر و قصبات تک پہونچا دیا، مولانا علاء الدین اصولیؒ بدایوں کے جید عالم، فاقوں سے بدحال ہو جاتے لیکن درس و تدریس کے معمول میں فرق نہ آتا، امام بخاریؒ کی طرح جن کو ایام طالب علمی میں جنگل کی بوٹیاں کھا کر گذر کرنی پڑی تھی، انھوں نے اکثر کنجارہ کھا کر گذارہ کیا، دہلی کے مشہور محدث مولانا کمال الدین زاہدؒ کو جن سے

[1] اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۳۷ – ۱۳۸۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے درس حدیث لیا تھا، سلطان بلبن نے اپنا امام بنانا چاہا، جواب دیا: "ہمارے پاس ہماری نمازیں ہی رہ گئی ہیں، کیا سلطان ان کو بھی لے لینا چاہتا ہے"۔ جو عالم مادی افکار میں مبتلا ہو جاتا تھا، جو حکومت کی ملازمت کی تمنا کو دل میں پرورش کرنے لگتا تھا اس کا اثر درسوخ وہ نہیں ہوتا تھا جو ان علماء کا ہوتا تھا جو عسرت و تنگی میں زندگی بسر کرتے تھے اور درس و تدریس میں اپنا وقت گذارتے تھے۔

علوم قرآن کتب خانۂ اسلام کی پہلی کتاب قرآن ہے، اس وقت اس کی دو حیثیتیں پیش نظر ہیں، ایک بہ حیثیت سرچشمۂ ہدایت، اور دوسرے بحیثیت علوم اسلامی کا مرکزی نقطہ قرآن نے خود کو هُدًى لِّلنَّاس کہا ہے، اور شفا، ہدایت اور رحمت کا خزانہ بتایا ہے، اس میں انسانی دلوں کی بیماری کا علاج بھی ہے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے مکمل لائحہ عمل بھی، لیکن یہ خود جن انسانوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہونے کا اعلان کرتا ہے وہ متقی ہیں جو غیب پر ایمان لائے، جنھوں نے نمازیں قائم کیں اور اللہ کے عطا کیے ہوئے رزق میں اس کے بندوں کو شریک کیا، یہ تین اصل اصول ہیں جن پر انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے، قرآن نے یہاں سیرت انسانی کی تعمیر کا پورا نقشہ پیش کر دیا ہے، اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جب افراد یا اقوام اس سے انحراف کرتے ہیں، جب ان کے دل اس ہدایت سے منھ موڑ لیتے ہیں تو پورا معاشرہ ابتری اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے، سورہ الحج میں ارشاد ہوتا ہے ؎

"پھر انسانوں کی کتنی ہی آبادیاں ہیں جن کو ان کی غفلت اور بداعمالی کی پاداش میں ہم نے ہلاک کر دیا، پس وہ اب ایسی اجڑی پڑی ہیں کہ ان کی دیواریں اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں، ان کے بہر کنویں بیکار ہو رہے ہیں، اور بڑی بڑی عمارتوں کے

محل یکسوں سے خالی ہیں، پھر کیا لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں، اور قوموں کے عروج و زوال کی نشانیوں کو دیکھتے نہیں؟ اگر دیکھتے تو ان کے دل سوچنے والے ہوتے اور کان سننے والے، اور جب تباہی کا وقت قریب آجاتا ہے تو قوموں کی آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔"

دل اس وقت اندھے ہوتے ہیں جب قرآن کی تعلیم ان کے لیے سرچشمۂ ہدایت نہیں رہتی اسلامی معاشرہ کی مضبوطی، اس کے نشوونما، اثر و نفوذ سب کا انحصار قرآن سے بصیرت حاصل کرنے پر ہے، بقول اقبالؒ :

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال ست و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

جہاں تک علوم اسلامی کے نشوونما کا تعلق ہے اس حقیقت کو پیش نظر ہونا چاہیے کہ علوم اسلامی کا سرچشمہ قرآن پاک ہے، بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ :

"مسلمانوں نے جس علم و فن کی خدمت کی، اس کی تحریک کا جذبۂ شوق در اصل قرآن پاک ہی کے کسی جزو کی خدمت کا ذوق اور جوش تھا، قرآن پاک کی آیتوں کی تشریح کی گئی تو علم تفسیر بن گیا، حامل قرآن کی قولی اور عملی تشریحوں کو جمع کیا گیا تو علم حدیث پیدا ہو گیا قرآن کے اعتقادی تعلیمات کی علمی تشریح کی گئی اور اس پر عقلی دلائل اور رد و قدح یکجا جمع کیے گئے تو علم کلام نے جنم لیا، قرآن کے قانونی مسائل پر جو بحثیں کی گئیں انھوں نے علم فقہ کا جامہ پہن لیا، قرآن پاک کے لفظوں سے کسی مسئلہ کے سمجھنے کے جو اصول بنائے گئے ان کا نام اصول فقہ ہو گیا، رسولؐ کی تشریحات پر روایتوں اور سندوں کی حیثیت سے جو گفتگو شروع ہوئی وہ اصول حدیث کا ماخذ قرار پائی، اور ان کے راویوں کی تاریخی اور اخلاقی گفت و شنید نے اسماء الرجال کا دفتر تیار کر دیا، قرآن پاک کے لفظوں کے صحیح مخرج، طرز ادا، وقف و سکون نے تجوید و قراءت کا فن پیدا کیا، ان لفظوں کی صحیح شکلوں کے جاننے پہچاننے اور ان کے صحیح اعراب کو معلوم کرنے سے صرف و نحو وجود میں آئی، قرآن کے لفظوں، لغتوں اور محاوروں کی دریافت کے لیے علم ادب اور علم لغت کی ترتیب ہوئی، غرض اسلامی علوم و فنون کا ہر خط در اصل اسی نقطہ سے شروع ہوا، اور کبھی کبھی آگے بڑھ کر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے مرکز سے دور نکل گیا، یا مرکز سے ہٹ گیا۔" (معارف جون ۱۹۳۷ء ص ۴۰۶)

حقیقتہً قرآن، اسلامی معاشرہ میں سیرت سازی کے کام کی بنیاد اور حکمت کی اساس ہے۔

ہندوستان میں علوم قرآن اگر اسلامی ہند میں اسلامی علوم اور اسلامی فکر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ علوم قرآنی کی داغ بیل اور مختلف حیثیتوں سے اس کا نشوونما اسلامی معاشرہ کی بڑھتی اور بدلتی ہوئی ضرورتوں کے تابع رہا، مسلمانوں نے جس علاقہ کو بھی فتح کیا وہاں مساجد و مدارس کے قیام کو اپنی ملی زندگی کی پہلی ضرورت سمجھا، یہ مسجدیں اور یہ مدرسے قرآن کریم کی تعلیم کے اولین مرکز تھے، اور مسلمانوں کی زندگی میں ان کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، یہیں سے قرآن کی تعلیم مختلف منزلیں اور مدارج میں پھیلتی اور نشوونما پاتی رہی، قرآن پڑھنا ناظرہ ہو یا حفظ، ترتیل سے ہو یا تجوید سے، کسی صورت میں ہو، اس کی ضرورت مسلمان آبادی کے لیے مسلم تھی، بچے کے کان میں اذان سے لے کر نماز جنازہ تک ہر ہر منزل پر اس کی ضرورت پیش آتی تھی، گو اس سب میں قرآن فہمی کو کم دخل تھا، اور عربی سے ناواقفیت کے باعث عوام کو قرآن کے مفہوم و مطالب سے آگہی نہیں تھی، بایں ہمہ زندگی کے جن کاموں میں بھی

قرآن کی ضرورت تھی اس کا پورا پورا اہتمام رہتا تھا، یہ نظام قصبات و دیہات تک پھیلا ہوا تھا، شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ قصبات میں کسی کو تعلیم قرآن میں مصروف دیکھتے تو فرماتے:

"نیکو کاریست، مشغولی بہ بے گناہان و مشغولی بہ قرآن" (خیر المجالس ۱۰۰)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ بچوں کے لیے قرآن کی تعلیم ان کی "سلامتی فطرت" کے لیے ضروری ہے، اس سلامتی فطرت کو انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "حجۃ اللہ البالغۃ" میں اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا ہے۔

عام مسلمانوں کو قرآن کے مفہوم و مطالب سے آشنا کرنے کی ضرورت کا احساس سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ کو پیدا ہوا، "فتح الرحمٰن" اسی احساس کا نتیجہ ہے، فرماتے ہیں کہ لوگ شغل معاش میں ایسے مشغول ہو گئے ہیں کہ فہم قرآن کی طرف ان کی توجہ نہیں، ضرورت ہے کہ بچوں کو ابتدائی منزل میں ہی جب وہ گلستان بوستان، مثنوی وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہوں یہ ترجمہ پڑھا دیا جائے، اگر دوسری کتابیں "کلام اولیاء اللہ" ہیں تو یہ "کلام اللہ" ہے، وہ مواعظ حکیماں ہیں تو یہ "مواعظ احکم الحاکمین" ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں تلاوت کلام پاک کا چرچا تو بہت رہا، لیکن قرآن کے مطالب کو بہت محدود حلقہ سمجھتا تھا، اس کا بڑا سبب عربی زبان سے ناواقفیت تھی، دوسری طرف دینی مسائل میں رہبری کا سارا کام علماء کے سپرد تھا، یہ صورت حال اس وقت تک کامیاب ہو سکتی تھی جب تک مسلمانوں کے معاشرہ پر بیرونی اثرات اور فکری ہیجان کا طوفان نہیں آیا تھا، سولہویں صدی سے ماحول میں تبدیلی آنے لگی، اور مذہبی بحثیں جو اکبر کے عبادت خانے میں شروع ہوئی تھیں انھوں نے پہلے علماء کی فکر کو، پھر عوام کے دینی احساس کو پہلے مجروح، پھر بیدار کیا، اکبر کے زمانے میں بدعات و احداث کا ہنگامہ برپا

نہ ہوتا اور مختلف گروہ قرآن ہی سے اپنے نظریات کی تائید کا سامان بہم پہنچانے کی کوشش نہ کرتے تو شاید قرآن فہمی کا وہ چرچا نہ ہوتا جو اس دور میں مجدد صاحبؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور دوسرے بزرگوں کی کوششوں سے شروع ہو گیا، روح قرآن سے جتنا قرب بڑھتا گیا اتنا ہی بدعات کے بادل چھٹتے گئے، اگر مجموعی طور پر غور کیا جائے تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہندوستان میں فہم قرآن کو عام کرنے کا کام حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے گھرانے کے لیے مقدر تھا، اور انھوں نے جس طرح اس کو انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے، ان کی خدمات حدیث، خدمات قرآن کے بعد آتی ہیں، وہ محدث سے پہلے مفسر قرآن تھے، انھوں نے قرآن کو مسلمان معاشرہ کی زندگی میں ایک زندہ حقیقت بنا کر پیش کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سیرت کی تعمیر میں پہلا اور مضبوط ترین بنیادی پتھر قرآن پاک کی تعلیم ہے، اگر یہ بنیاد صحیح رکھ دی جائے تو پھر ساری عمارت فکری حوادث اور معاشی ترددات سے محفوظ ہو جاتی ہے، نہ افکار کی آندھیاں اس کو متاثر کر سکتی ہیں نہ معاشی زندگی کی تلخیاں اس کے پائے ثبات میں لغزش کا سبب بن سکتی ہیں، اس کی محض تلاوت بھی زندگی کا نقشہ بدل سکتی ہے، بقول اقبال:

زشام ما بروں آور سحر را　　بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرأت تو　　دگرگوں کرد تقدیر عمر را

سر سیدؒ کا خیال تھا کہ تلاوت کلام پاک بغیر معنی سمجھے بھی روحانی تربیت کا ذریعہ ہے، لکھتے ہیں:

"بغیر معنی سمجھائے قرآن مجید پڑھانا جس کو ایک حقارت سے دیکھا جاتا ہے، میری

دانست میں کوئی ذریعہ اس سے زیادہ روحانی تربیت، روحانی نیکی اور توجہ ذات باری

کے لیے نہیں ہو سکتا۔" (لیکچرس، ص ۲۶۷)

حفظ قرآن | قرآن کریم غالباً دنیا کی واحد آسمانی کتاب ہے جس کے باقاعدہ حفظ کا اہتمام کیا گیا ہے، ہندوستان میں مدرسوں اور خانقاہوں دونوں میں حفظ قرآن پر زور دیا جاتا تھا حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے جماعت خانے خصوصیت کے ساتھ حفظ قرآن کے مرکز بن گئے تھے، اور ہر وقت حفظ و قرأت کی صدائیں وہاں سے بلند ہوتی رہتی تھیں، بابا صاحبؒ خود اعلیٰ مریدوں کو درس قرآن دیتے تھے اور ان کو رموز قرأت سے آگاہ کرتے تھے، خانقاہوں میں کتابت کلام پاک کا کام بھی جاری رہتا تھا خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں کلام پاک حفظ کیا تھا شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ان سب بچوں کو جو ان کے دامن تربیت سے وابستہ تھے (مثلاً اپنے بھانجے اور بعض نواسے) کلام پاک حفظ کرایا اور ایک باکمال حافظ مولانا علاء الدینؒ کو اس کام پر مامور کیا، جو بچے حفظ نہ کرتے تھے ان کو مسجد میں بھیج دیا جاتا تھا کہ قاریوں کو سنیں اور اپنی قرأت کو درست کریں، شیخ حمید الدین ناگوری خلیفہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ناگور کے ایک گاؤں سوال میں رہتے تھے، وہاں کی مساجد میں بھی حفظ کلام پاک کا چرچا تھا، وہ اپنے بچوں کو جمعہ کے دن خاص طور پر وہاں بھیجتے کہ عصر کی نماز تک وہاں رہیں اور سنیں کہ

"حافظان چگونہ قرآن می خوانند ؛ مردم تشنہ در چگونہ نگاہ می دارند" (سرور الصدور ۶۵، قلمی)

فرمایا کرتے تھے کہ حفظ قرآن کا تعلق خالصۃً دل سے ہے، اگر دل کے ساتھ تین بار پڑھ لیا جائے تو یاد ہو جاتا ہے، بے دلی سے ہزار بار بھی پڑھا جائے تو یاد نہیں ہوتا۔ (سرور الصدور قلمی ۶۵)

ہندوستان میں عورتوں کے حفظ قرآن کا بھی ذکر ملتا ہے، غیاث الدین خلجی کے متعلق تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے:

"ہزار کنیزک حافظ قرآن در حرم داشت"

بادشاہوں اور شاہی خاندانوں میں بھی حفظ قرآن کی بعض مثالیں ملتی ہیں، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ میں لکھا ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک ابتدائی زمانے میں "قرآن خوان" مشہور تھا (ص ۲۱) سلطان محمود بیگڑہ کے بیٹے شاہزادہ خلیل نے قرآن حفظ کیا تھا (مرآۃ محمدی ص ۹۱)

(باقی)

کچھ سعدی شیرازی کے بارے میں

از

پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ

(۲)

۱۲۔ سعدی کی غیر معمولی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے بیشتر کلام سے ہر طبقہ کا آدمی محظوظ ہوتا ہے، اس میں بچوں، جوانوں، بوڑھوں، درویشوں، بادشاہوں غرض ہر شخص اور ہر قوم کے لیے درس موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی ۲ دو مخصوص کتابیں یعنی گلستاں و بوستاں چھوٹی عمر کے بچوں سے لیکر جوانوں اور بڑے بوڑھوں تک کے درس و مطالعہ میں شامل رہی ہیں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ دنیا میں کم کتابوں کو اتنی عمومی قبولیت کی سند ملی ہو گی جیسا کہ ان ۲ دو کتابوں کو، اور ان کتابوں میں جدید دور کے اخلاقی بگاڑ کے دور کرنے کا کافی سامان موجود ہے اور اسی بنا پر اکثر سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا ہے کہ ان دونوں کتابوں کو ہمارے ملک کے مروجہ نصاب میں بڑی جگہ ملنا چاہیے۔

میری اس گذارش کا مدعا یہ ہے کہ سعدی جیسا انسان دوست ادیب جس نے اپنی ساری کاوشوں کو درس اخلاق کے عام کرنے میں صرف کیا اور جس کی شخصیت انسانیت کے جوہر اعلیٰ سے مزین تھی اور جس کا قلم معجز نگار تھا، نہ صرف اپنے وطن کا محبوب ترین شاعر و ادیب تھا بلکہ اس نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی تھی،

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ چین کے شہر خنسا میں ایک امیر کا مہمان تھا، امیر نے اس کے اور اس کے رفقا کے ساتھ بڑی محبت اور خلوص کا برتاؤ کیا، ابن بطوطہ کی جماعت تین روز امیر کی مہمان رہی، امیر نے ان کو سیر کرانے کے لیے اپنے بیٹے کو ساتھ کیا، ایک کشتی میں ابن بطوطہ اور اس کے رفقا بیٹھے دوسری میں امیر کا بیٹا، اس کے ساتھ گویے اور قوال تھے، وہ چینی، عربی، فارسی تینوں زبانوں کے اشعار گاتے تھے، امیر کے بیٹے کو فارسی موسیقی کا بڑا شوق تھا اور جب گویوں نے ایک مخصوص نظم گائی تو اس نے اس کے تکرار کا حکم دیا، قوالوں نے اس کو اتنا گایا کہ ابن بطوطہ کو یہ دلچسپ نظم یاد ہوگئی جو اس کے سفر نامہ میں اس طرح درج ہے:

تا دل بہ محنت دادم
در بحر فکر افتادم

چون در نماز استادم
قوی بمحراب اندری

فارسی کی نظم رحلۂ ابن بطوطہ میں غلط نقل ہوئی ہے، بہت ممکن ہے کہ یہ کتابت اور طباعت کی غلطی کا نتیجہ ہو اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ابن بطوطہ فارسی سے واقف تھا، بہرحال رحلہ میں منقول یہ غلط بیت مدتوں تک اس رحلہ کے مترجموں اور مصححوں کے لیے زحمت کا باعث بنی رہی، ۱۹۵۰ میں انتقادی ایڈیشن کے موقع پر ایران کے محقق شہیر میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے اس بیت کی تصحیح کی اور اس کو سعدی کی غزلیات کے مجموعہ "بدائع سعدی" میں ڈھونڈھ نکالا، بیت مذکور یہ ہے:

تا دل بہ مہرت دادہ ام در بحر فکر افتادہ ام
چون در نماز استادہ ام گوئی بمحراب اندری

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قوالوں نے صرف ایک شعر نہ گایا ہوگا، بلکہ غزل کے اکثر اشعار گائے گئے ہوں گے، غزل کی تیسری بیت میں چین کے مصور کا ذکر آیا ہے، اس کے

نہ گانے کا امکان کم ہی ہے غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

آخر نگاہے باز کن وقتی کہ بر ما بگذری
یا کبر منعت می کند کز دوستان یاد آوری

ہرگز نبود اندر ختن بر صورتی چندین فتن
ہرگز نباشد در چمن سروی بدین خوش منظری

صورتگر دیبای چین گو صورت رویش ببین
یا صورتی برکش چنین یا توبہ کن صورتگری

تا نقش می بندد فلک کس را نبود ست این نمک
ماہے ندانم یا ملک فرزند آدم یا پری

تا دل بمہرت دادہ ام در بحر فکر افتادہ ام
چون در نماز استادہ ام گوئی بمحراب اندری

ہر کس کہ دعوی می کند کو با تو زنی میکند
در عہد موسیٰ می کند آواز گاو سامری

ابن بطوطہ سعدی کی وفات کے تقریباً پچاس سال کے اندر چین پہنچا تھا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سعدی کی زندگی ہی میں ان کی شہرت چین تک پہنچ گئی تھی، اور سعدی کی اس شہرت میں ہندوستان کا بڑا حصہ ہے،

ایک اور واقعہ کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا،

شمالی سماترا میں کسی نائنا حسام الدین کی قبر ہے جس پر کلمہ، چند آیات قرآنی اور آیت الکرسی کندہ ہیں اور نیچے کے پتھر پر چاروں حاشیے میں یہ اشعار جو کافی مٹ چکے ہیں پائے جاتے ہیں:

بسیار سالہا بسر خاکِ ما رود
کاین آب چشمہ آید و باد صبا رود

این پنج روزہ مہلت ایام آدمی
بر خاک دیگران بتکبر چرا رود

ای دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری
شادی مکن کہ با تو ہمیں ماجرا رود

خاکت در استخوان رود ای نفس خیرہ چشم
مانند سرمہ داں کہ دران توتیا بود

دامن کشاں کہ می رود امروز بر زمین
فردا غبار کالبدش بر ہوا رود

بوسائیان حسنِ عمل اعتماد نیست — سعدی مگر بہ سایۂ لطف خدا رود

یہ غزل سعدی کی ہے اور طیبات میں منقول ہے، اس میں چوتھی بیت دامن کشاں والی نہیں ہے اور حسب ذیل تین بیت اور زیادہ ہیں،

دنیا حریف سفلہ معشوق بیوفاست — چون میرود ہر آئینہ بگذار تا رود

اینست حال تن کہ تو بینی بزیر خاک — تا جان نازنین کہ برآید کجا رود

یارب مگیر بندۂ مسکین و دستگیر — کز تو کرم فزاید و از ما خطا رود

صاحب قبر نائنا حسام الدین کا تعلق ہندوستان سے معلوم ہوتا ہے نائنا قبر کے بارے میں Times of India ۱۰ اگست ۱۹۸۴ء ص ۱۶ پر شایع شدہ ایک طویل اطلاع کا خلاصہ یہ ہے،

کوچین (کیرالا) میں کوچن گڈی نام کا ایک قصبہ ہے جس کی آبادی ۲۵ ہزار کے لگ بھگ ہے، اس میں ایک دو منزلہ قدیم مسجد ہے جس میں کوئی کتبہ وغیرہ نہیں، البتہ بعض زبانی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے یہ مسجد کسی عرب کی بنوائی ہوئی ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ مسجد اس زمین میں بنی ہے جو کوچین کے ہندو حکراں نے مسلمانوں کے ایک فرقہ نائنا کو دی تھی، اس فرقے کے لوگ اپنے کو ان مسلمانوں کی اولاد بتلاتے ہیں جو نائر فرقہ سے مسلمان ہوئے تھے ۱۹۴۱ء تک اس مسجد کا نظم و نسق نائنا فرقے کے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، بعد میں عدالت کے ایک فیصلہ کے مطابق یہ انتظام نائنا اور غیر نائنا مسلمانوں کی ایک کمیٹی کو سپرد کیا گیا، جس میں دونوں کی تعداد برابر ہوتی، ابھی حال تک نائنا اور غیر نائنا مسلمانوں میں شادی بیاہ بھی نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ نائنا اپنے کو اونچا سمجھتے تھے، نائنا کہتے ہیں کہ وہ کوچین کے شاہی گھرانے کے رسوم میں برابر شریک

ہوتے، ایک ریٹائرڈ انکم ٹیکس آفیسر کا جو نائنا مسلمان ہے قول ہے کہ شاہی گھرانے کی تقریبات میں اس نے اپنے فرقہ کی نمایندگی کی تھی۔

غرض بخوبی ممکن ہے کہ سماترا میں اس خاندان کے لوگ جا بسے ہوں، انھیں میں صاحب قبر نائنا حسام الدین بھی ہوں،

سعدی دنیا کے ان بڑے ادیبوں اور شاعروں میں ہیں جن کی شہرت اور مقبولیت ان کے زمانے سے لے کر آج تک یکساں طور پر قائم ہے اور یہ شہرت عالمگیر ہے، صرف انہیں ملکوں تک محدود نہیں جہاں فارسی اور فارسی تہذیب کا چلن ہے، بلکہ ایسے ملک کے لوگ بھی سعدی کی عظمت کا بخوبی احساس رکھتے ہیں جن کی زبان فارسی نہیں، ان ملکوں میں سعدی کو ترجمے سے سمجھا گیا ہے اور یہ بات تو بخوبی روشن ہے کہ سعدی کے کلام کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے اور بعض زبانوں میں متعدد بار اس کے باوجود یہ بات حیرت کی ہے کہ ایسے عظیم دانشور شاعر کے بارے میں بنیادی بہت ہی کم کام ہوا ہے، سعدی کا کلام دور حاضر کے نقادوں اور محققوں کی عدم التفات پر ہزار آنسو بہا رہا ہے، ابھی تو انکے کلام کا انتقادی متن جس توجہ کا محتاج ہے، اتنی توجہ اس کی طرف نہیں ہوئی، کلیات کے دو ایک ایڈیشن نکلے لیکن کوئی بھی فروغی کے ایڈیشن پر مخصوص اضافہ نہ کر سکا۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے اور کلام کے مقابلے میں ان کی دو کتابیں گلستان و بوستان کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ ہوئی ہے اور وہ متعدد بار اڈیٹ ہو کر شایع ہو چکی ہیں، خوشی کی بات ہے کہ کلیات کے کافی قابل اعتبار مخطوطے سامنے آچکے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے باہمی مقابلے سے ایک انتقادی متن تیار کیا جائے جو الحاق وغیرہ

نقائص سے پاک ہو، اس موقع پر تحقیق کے بارے میں بعض نقادوں کا ایک خاص نقطۂ نظر جو میرے نزدیک نہایت خطرناک ہے اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، کلیات سعدی کے نسخۂ مکتوبہ ۷۱۰ھ کی دریافت پر ایران کے عظیم دانشور میرزا محمد قزوینی نے اپنی انتہائی مسرت کا اظہار کیا، اس میں ایک غزل سلغری خاندان کے آخری فرماں روا ابش خاتون (م: ۶۸۵ھ) کی مدح ہے گویا سعدی کے ممدوحین میں اس سے ایک اور اضافہ ہوا اور ان دنوں میرزا محمد ممدوحینِ سعدی پر ایک کتابچہ تیار کر رہے تھے، اس لیے انہوں نے ۱۳- آذر ۱۳۱۶ شمسی میں ایک خط لکھا اور اس میں اس نسخہ کی مزید وضاحت چاہی تھی اور خط کے آخری جملے یہ تھے:

"یقین دارم کہ چون سعدی مطلوب کل طالب و محبوب و مرغوب ہر راغب استاد اختصاصی بہ بندہ ندارد ہر چہ مساعدت درین باب بہ بندہ بفرمائید بہ تکمیل اطلاعات راجع بہ آن بزرگوار فرمودہ خواہید بود۔۔"

اس پر علی دشتی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "ہمارے دور میں تحقیق میں اہل یورپ کی مثبت روش کی پیروی ہو رہی ہے، لیکن اس سلسلے کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات ایسے جزئی امور میں بے وجہ کی تحقیق عمل میں آتی ہے جو مورد بحث موضوع کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی اور اس طرح کی تحقیق غیر مفید اور عبث ہے"، خط کے نقل کے بعد نہایت طنز آمیز لہجے میں موصوف رقمطراز ہیں:

"این شور و التہاب برای دست یافتن بغزلی است کہ اگر بدست نمی آمد از سعدی چیزی کاستہ نمی شد چنانکہ اکنون کہ این "تحفہ" پیدا شدہ و متر جاذبہ بر نبوغ او کشف گردیدہ است، بر سعدی چیزی نیفزودہ"

آگے فرماتے ہیں:

"پس ایسے امور کی تحقیق کرنی چاہیے جو کسی شخصیت کے بنانے میں موثر رہے ہوں، سال تولد و ماہ وفات و تعداد اولاد و سفر اور ممدوحین کی تحقیق میں صفحات پر صفحات سیاہ کرنا بجز ملال کے کچھ نتیجہ خیز نہیں، البتہ یہ وقائع اگر اس کی معنویت یا شخصیت کو متاثر کرتے ہیں تو اور بات ہے۔

مجھے علی دشتی کی رائے سے اختلاف ہے، اس لیے کسی شاعر، ادیب کی زندگی کی جزئیات اگر اس شخصیت کے بنانے یا بگاڑنے میں کسی نہ کسی درجہ میں اثر رکھتی ہیں، وہ کب پیدا ہوا، کس ماحول میں پیدا ہوا، اس کے والدین کون تھے، اس نے کہاں کہاں سفر کیے، سفر میں کن کن افراد سے ملاقات کی، کن کن افراد سے متاثر ہو کر ان کی مدح کی، کب اور کن حالات میں وفات پائی، خاندان کے کون کون افراد تھے اور ان کی شخصیت کے کون کون سے پہلو قابل توجہ ہیں۔ اس طرح کے سارے امور علی دشتی کی نظر میں اہم ہوں یا نہ ہوں اصلاً نہایت اہم ہیں۔ علی دشتی تو ایسے نقادوں میں ہیں جو کسی شاہکار کا مطالعہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے نہیں کرتے بلکہ محض حظ حاصل کرنے کے واسطے، کسی تاریخی کتاب یا علمی کتاب سے ان کو حظ حاصل نہیں ہوگا اس لئے ان کا مطالعہ ان کے اصول کی رو سے محض عبث ہے، اور میرا تو خیال یہ ہے کہ تاریخ ہو یا کوئی اور علم، اس کے حصول سے استفادہ کرنے والوں کو بڑا اطمینان اور سکون ہوتا ہے اگر یہ اطمینان نہ ہو تو دنیا میں کوئی بڑا کام وجود میں نہیں آسکتا، بڑی بڑی تحقیقات اسی جذبے کے نتیجے میں عمل میں آتی ہیں۔

میری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ سعدی کے کلام کا تعین نہایت ضروری ہے لیکن ان

کہ مدحیہ غزل بڑی بلند پایہ ہے ہو بہر حال یہ خود سعدی کی نظم ہے، نہ جانے کن حالات میں کہی گئی، یہ بھی ہے کہ سعدی کہیں بہت ہی بلند تو کہیں پست بھی نظر آتے ہیں، بہر حال جو کچھ انھوں نے لکھا ہے قطع نظر اس کے مرتبہ کے، سب کا سب ان کے کلام میں شامل ہونا چاہیے۔

سعدی کے کلام میں بعض اور امور کلام کی تحقیق کے وجوہ فراہم کرتے ہیں بوستان میں باب ہفتم میں ایک حکایت ہے جو بعض نسخوں میں اسطرح شروع ہوتی ہے:

اگر گوش دارد خداوند ہوش　　سخنہای پیران خوش آید بگوش
سفر کردہ بودم ز بیت الحرام　　در ایام ناصر بدار السلام
شبی رفتہ بودم بکنجی فراز　　بچشم در آمد سیاہی دراز

اگر یہ روایت صحیح سمجھی جائے تو یہ فرض کرنا پڑے گا کہ سعدی ناصر خلیفہ کے زمانے میں بغداد تشریف لے گئے تھے، ناصر کی وفات ۶۲۲ھ میں ہوئی تھی، یعنی سعدی کی وفات سے ۶۹ سال قبل، یہ واقعہ اسوقت تک درست نہیں ہو سکتا، جب تک سعدی کی عمر سو سال سے زیادہ نہ قیاس کی جائے اور اس کا بحالت موجودہ کوئی قطعی ثبوت نہیں، اس بنا پر یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ بوستان کے یہ اشعار قابل وثوق نہیں، اتفاق سے پیرس کے مخطوطہ میں جو ۷۰۶ھ کا مکتوبہ ہے، اس میں اشعار بالا کے بجائے یہ اشعار ملتے ہیں:

چنیں گفت پیری پسندیدہ ہوش　　خوش آید سخنہای پیران بگوش
سفر کردہ بودم ز بیت الحرام　　در ایام ناصر بدار السلام
شبی رفتہ بودم بکنجی فراز　　بچشم در آمد سیاہی دراز

اس سے صورت بالکل بدل گئی، اب یہ حکایت سعدی سے منسوب نہیں بلکہ کسی بزرگ کی ہے، علی گڈھ کے مخطوطے میں جو ۷۱۰ھ کا مکتوبہ ہے یہ اشعار اسطرح پر ہیں:

چنیں گفت پیری پسندیدہ ہوش　　خوش آید سخنہای پیران بگوش
کہ در مصر رفتم بکنجی فراز　　چہ دیدم در آن جا سیاہی دراز

اس میں تین بیت کے بجائے دو بیت ہیں اور ناصر خلیفہ کا نام بالکل غائب ہے، یونسکو کی طرف سے جو نسخہ ۱۳۶۳ میں چھپا ہے اس میں بھی دو ہی بیت اس طرح سے منقول ہیں:

چنیں گفت پیری پسندیدہ ہوش　　خوش آید سخنہای پیران بگوش
کہ در ہند رفتم بکنجی فراز　　چہ دیدم ؟ چو یلدا سیاہی دراز

اس سے بالکل ایک نئی صورت سامنے آئی یعنی یہ کہ یہ کسی بزرگ کا واقعہ ہے اور اس واقعہ کا تعلق مصر سے نہیں، ہندوستان سے ہے،

ایک اور مثال سے سعدی کے کلام کے انتقادی متن کی ضرورت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، گلستان کے اکثر مطبوعہ نسخوں میں شیخ عبدالقادر گیلانی کی حکایت اس طرح شروع ہوتی ہے:

"شیخ عبدالقادر گیلانی را رحمۃ اللہ علیہ دیدم در حرم کعبہ ..."

اس سے واضح ہے کہ سعدی شیخ سے کعبہ میں ملے ہیں، شیخ مذکور کی وفات ۵۶۱ھ میں ہوئی، گویا سعدی کی وفات سے ۱۳۰ سال قبل ہے، واضحاً گلستان کی یہ روایت قابل قبول نہیں، چنانچہ اس کے بعض نسخوں میں حکایت بالا کی ابتدا اسطرح پر ہے:

"شیخ عبدالقادر گیلانی را رحمۃ اللہ دیدند در حرم کعبہ ..."

اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ یہ واقعہ سعدی کا نہیں کسی اور کا ہے جس کو سعدی نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ان مثالوں سے تصحیح متن کی اہمیت واضح ہے اور ان سے علی دشتی جیسے نقادوں کے نقطۂ نظر کا ابطال ہوتا ہے سعدی کے کلیات کے کافی قدیم نسخے مکشوف ہو گئے ہیں، ان میں چند یہ ہیں:

(۱) ۷۱۰ھ کابل افغانستان (۲) ۷۱۸ھ تہران، اسی کے بارے میں محمد قزوینی کا خط ہے، (۳) ۷۲۰ھ تہران، مجلس (۴) ۷۲۶ھ کابل افغانستان (۵) ۷۲۰ھ انڈیا آفس لندن (۶) ۷۶۶ھ مملوکہ ڈاکٹر رضا صحت (۷) ۷۶۷ھ نیشنل لائبریری پاریس (۸) ۷۸۰ھ امپیریل لائبریری سینٹ پیٹرس برگ (۹) ۸۰۲ھ مہدوی، تہران (۱۰) ۸۰۵ھ مجلس، تہران (۱۱) ۸۱۴ھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری (۱۲) ۸۲۴ھ سبز پوش، گورکھپور

یہ تو رہی کلیات سعدی کے تنقیدی متن کی اشاعت کا معاملہ، اب چند باتیں شیخ کی زندگی کے تعلق سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں، ان کے اصلی نام کے بارے میں اختلاف ہے، شرف الدین، مشرف الدین، مصلح الدین بتائے جاتے ہیں۔ ۷۱۰ھ کے نسخے میں مشرف الدین مصلح السعدی، کابل کے ۷۲۶ھ والے نسخے میں بھی مشرف الدین مصلح ہے، انڈیا آفس کے ۷۲۰ھ والے نسخے میں مشرف بن مصلح السعدی کی جگہ آیا ہے علی گڑھ کے ۸۱۴ھ والے مخطوطے میں مصلح الدین سعدی اور ۸۲۴ھ کے سبز پوش کے مخطوطے میں شیخ مشرف الدین سعدی، حیات سعدی میں شرف الدین ہے۔

والد کا نام دو طرح پر ملتا ہے، عبداللہ اور مصلح، عام روایت میں عبداللہ ہے، لیکن کلیات کے بعض نسخوں میں سعدی کا نام مشرف الدین اور باپ کا نام مصلح ملتا ہے، ایسا خیال ہوتا ہے کہ مشرف الدین مصلح السعدی میں شاید اضافت اپنی آگئی ہو،

سفر کے بارے میں جو معلومات ہیں وہ بھی شبہ سے پاک نہیں، گلستاں کی ایک حکایت سے معلوم ہوا کہ جب محمد خوارزم شاہ نے ختا کے فرمانروا سے صلح کی تو اس وقت سعدی کاشغر میں تھے، محمد خوارزم شاہ کی خان ختا سے دو جنگیں ۶۰۶ اور ۶۰۷ میں ہوئیں، یہ واقعات سعدی کی وفات سے ۸۴ یا ۸۵ سال قبل کے ہیں، اس تاریخ میں سعدی کی پیدائش بھی قطعی طور پر ثابت نہیں، رہا شہرت کا مسئلہ، تو وہ تو کافی بعد کا ہوگا، بوستان ۶۵۵ اور گلستان ۶۵۶ھ میں مرتب ہوئی، یہی دو کتابیں خصوصیت سے سعدی کی بیشتر شہرت کی ضامن ہیں، ۶۰۶ یا ۶۰۷ میں جب سعدی اپنے کو کاشغر میں بتاتے ہیں، ان کی شہرت کا معاملہ غلط معلوم ہوتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر سعدی کی متذکرۂ بالا حکایت مشتبہ ہو جاتی ہے،

اسی طرح سعدی کے قیام سومنات کا معاملہ ہے، سعدی نے سفر سومنات کا ذکر بوستان کی ایک طویل حکایت میں کیا ہے، اگرچہ اس واقعے میں کوئی تاریخی قباحت نہیں، البتہ واقعہ میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ ہی مشتبہ ہو جاتا ہے، بت کو ہاتھی کے دانت کا بتایا ہے، ہاتھی کے دانت کے بت نہیں بنتے، برہمنوں کو پازند خواں بتایا ہے، پازند اول کتاب کا نام نہیں، دوم اس کا تعلق زردشتیوں سے ہے زند کو برہمنوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ برہمن شدم در مقالات زند، برہمن کو گبر اور مطران کہا ہے، گبر کا تعلق بھی زردشتیوں سے ہے اور مطران کا عیسائیوں

برہمن مطران آذر پرست کہا گیا ہے جو نہایت لغو ہے، برہمنوں کے لیے ایسی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جن میں سے بعض کا تعلق زردشتیوں سے، بعض کا عیسائیوں سے اور بعض کا مسلمانوں سے، ان کے علاوہ اصل واقعے میں بھی دور از قیاس باتیں ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام برہمن اور پجاری سعدی کے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جائیں، اور اس طرح ان کو موقع دیں کہ وہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے جو چاہیں کریں؛

سعدی کے سومنات جانے کا معاملہ بڑا اختلاف آرا ہے، بعض ناقدین اس کو سرے سے بے حقیقت بتاتے ہیں، بعض اس کی صداقت کے قائل ہیں، حال ہی میں دو مقالے "حکایت سفر سومنات" سے متعلق امریکا کے دو رسالوں میں نظر سے گذرے، ایک انگریزی میں اور دوسرا فارسی میں، دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑی حد تک توافق پایا جاتا ہے، فارسی والا مضمون "ایران نامہ" تابستان ۱۳۶۴ھ شمسی - ۱۹۸۵ء میں پروفیسر جلال متینی نے شایع کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس حکایت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، دراصل یہ ایک منظوم مقامہ ہے، جس میں داستان فرضی ہوتی ہے، اس کو شاعر خود گڑھتا ہے، اور اس طرح وہ واقعہ اس کی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا، گویا سفر سومنات کی داستان سعدی کی گڑھی ہوئی ہے، اس کو براہ راست ان کی زندگی پر منطبق کرنا درست نہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"بررسی حکایت سفر سومنات: روشن می سازد کہ سعدی درین حکایت نیز یکی از وقائع زندگی خود را بہ رشتۂ نظم نکشیدہ است بلکہ وی بہ تقلید مقامہ نویسان وحد اقل بشیوہ و اسلوب دو حکایت دراز مقامہ مانندش در گلستان بہ تجربۂ دیگر دست زدہ است، سعدی در کتاب گلستان در چہار چوب کلی مقامہ نویسی تغییراتی اساسی

دادہ است تا نوشتۂ اش ہم با طبیعت زبان فارسی سازگار در آید و ہم باب پسند فارسی زبانان قرار بگیرد، بنظر نگارندۂ این سطور سعدی در حکایت سفر سومنات نیز ہمانند مقامہ نویسان، نخست بہ خلق داستانی دست زدہ و قصدش ازین کار در درجۂ اول آن بودہ است کہ برای خوانندگان کتابش حکایتی گیرا و جالب توجہ و سرگرم کنندہ حتی پرہیجان بنویسد"

بہت ممکن ہے کہ متینی صاحب کی رائے ہمارے لیے قابل قبول نہ ہو، بہرحال انھوں نے گلستان اور بوستان کی ان داستانوں میں مندرج واقعات کی توجیہ کی ہے، جو بادی النظر میں تاریخی لحاظ سے غلط معلوم ہوتے ہیں۔

سعدی کی تصانیف میں بھی اختلاف نظر ہے، بعض نقاد "کریما" کی نسبت کو مشکوک سمجھتے ہیں، سعدی کی طرف ایک ترجمۂ قرآن منسوب ہے، بلکہ ان کے نام سے چھپ بھی چکا ہے، بعض اس نسبت کو غلط ٹھہراتے ہیں، کچھ عرصے پہلے اس ترجمے کا ایک قدیم نسخہ پاکستان میں منکشف ہوا، جو تحقیق سے سعدی کا نہیں ٹھہرا لیکن اس نسخے کے بارے میں جو تحقیق ہوئی وہ شایع نہیں ہوئی، اس بنا پر ہمیں معلوم نہیں کہ کن دلائل کی بنا پر اس ترجمے کی نسبت سعدی کی طرف غلط ٹھہرائی گئی، بہرحال یہ اہم موضوع تحقیق اور ہماری توجہ کا محتاج ہے۔

سعدی پر مختلف زبانوں پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان کی تعداد دو ہندسوں تک نہیں پہنچتی، یہ بڑے شرم کی بات ہے، ہمارا یہ عمل اس دانشور کے بارے میں ہے جس کا شمار دنیا کے عظیم دانشوروں اور شاعروں میں ہوتا ہے، البتہ یہ قابل ذکر ہے کہ حالی نے حیات سعدی لکھ کر ہندوستان کا قرضہ چکا دیا ہے، یہ اپنے موضوع پر نہایت قدیم

تصنیف ہے اور نہایت اہم بھی، خوشی کی بات ہے کہ یہ فارسی میں منتقل ہو گئی ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ادھر ہندوستان میں سعدی کے بعض ترجمے شائع ہوئے ہیں، وہ معیاری نہیں، ان میں تفہیم متن اور تشریح و تعلیق وغیرہ کے سلسلے میں غلطیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً انوری کو محمود غزنوی کے دور کا شاعر بتایا گیا ہے، گیلان کا جائے وقوع مضافات بغداد میں قرار دیا گیا ہے، بلخ کو توران میں بتایا ہے، اگرچہ توران اب کسی ملک کا نام نہیں، اگر اس سے ماوراء النہر سمجھا جائے تو بھی مترجم کا بیان غلط ہے اس لیے کہ بلخ آمو دریا کے نیچے افغانستان میں مزار شریف سے چند میل کے فاصلے پر ہے، کاشغر کو بھی توران میں بتایا گیا ہے، عمرو لیث کے بارے میں دلچسپ انکشاف ہے۔ عمرو لیث ایک بادشاہ فارس کا نام تھا جس نے شہر شیراز آباد کیا تھا: بعض کہتے ہیں کہ وہ لیث کا بیٹا تھا اور لیث شہر کو کہتے ہیں۔ آخری جملوں سے یہی مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ عمرو لیث آدمی کا نہیں شیر کا بیٹا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عمرو لیث میں اضافت ابنی ہے، یعنی عمرو بن لیث، لیث عمرو کے باپ کا نام تھا۔ اس کا بڑا بھائی یعقوب لیث صفاری خاندان کا بانی ہے، یعقوب کی وفات (۲۶۵ھ) پر عمرو تخت نشین ہوا۔ عمرو ۲۸۷ میں امیر اسماعیل سامانی سے شکست کھا کر اسیر ہوا۔ پھر بغداد بھیج دیا گیا اور دو سال بعد قتل کر دیا گیا۔ شیراز آباد کرنے[1] کی روایت بھی غلط ہے یہ شہر ۲۶۵ھ سے بہت قبل سے

[1] شیراز کا بانی حجاج بن یوسف کا بھائی محمد بن یوسف ہے، عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت (۶۵ھ تا ۸۶ھ) میں یہ شہر آباد ہوا، عمرو بن لیث نے ۲۸۱ھ میں شیراز میں مسجد جامع تاسیس کی جو مسجد عتیق کے نام سے مشہور ہوئی (شیراز نامہ ص ۴۳)

ہی موجود تھا اور خود اس کے بھائی یعقوب لیث نے اس تاریخ سے دس سال قبل جمادی الاول ۲۵۵ ہجری میں اس کو فتح کر لیا تھا (دیکھ تاریخ طبری و تاریخ سیستان)

میری گذارش یہ ہے کہ اس طرح کی غیر معیاری کتابوں کی اشاعت شرمناک امر ہے اور ہماری بدنامی کا سبب۔

ضرورت ہے کہ گلستان و بوستان کے انتقادی متن تیار کیے جائیں اور انکے اعلیٰ ترجمے شایع کیے جائیں اور ان کو ہندوستان کے اعلیٰ درجے کے درسیات میں شامل کیا جائے، گلستان و بوستان اب فارسی کے نصاب میں کم نظر آتی ہیں، یہ دونوں کتابیں ایسی ہیں جن کو فارسی کے اونچے نصاب میں جگہ ملنی چاہیے، سعدی کی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ اقدار کے بحران کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سعدی کی تعلیمات و تجربات سے بڑی روشنی اور رہنمائی مل سکتی ہے۔

اقبالؒ اور دنیائے عربؒ

از

ڈاکٹر بدرالدین بٹ۔ کوئل۔ پلواما۔ کشمیر

ڈاکٹر اقبال کی برابر یہ خواہش رہی کہ کاش وہ عربی میں شعر کہہ سکتے لیکن ان کا یہ ارمان پورا تو نہیں ہو سکا[1] مگر ان کے فارسی اور اردو کلام کو منظوم اور منثور ترجموں کے ذریعہ عربوں تک پہنچایا گیا جس سے ایک حد تک تلافی مافات ہوئی۔

اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کا سلسلہ سنہ ۱۹۴۶ء سے ہی شروع ہوا جب مرکزی بزم اقبال حیدرآباد دکن نے الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال کے نام سے ایک کتاب شایع کی جس کی اشاعت دوم کراچی سے سنہ ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔[2] اس کے بعد اقبال کے کلام کے ترجموں اور ان پر مستقل تصانیف کا آغاز ہوا جو ابھی تک جاری ہے اور آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ اقبال شناسی کی کاوشیں آئندہ بھی جاری رہیں گی۔

دنیائے عرب میں اقبال کی شاعری اور افکار کو عام کرنے میں سب سے پہلے مرحوم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے مربوط طور پر کام کیا۔ انھوں نے نہ صرف کلام اقبال کا منظوم ترجمہ کیا بلکہ اقبال کی حیات، شعر و فلسفہ اور ادب پر بھی کتابیں اور مقالے لکھے جو عرب قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ڈاکٹر عزام کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر عزام کی خدمت اسلام و ادب کی ایک بڑی خدمت ہے جو ہر قدردانی اور شکر و اعتراف کی مستحق ہے۔ یہ اقبال کی خوش نصیبی

تھی کہ انھیں عزام سا ترجمان ملا۔ اقبال کی روح ان کی اس محنت و محبت پر یقیناً بہت مسرور ہوئی ہوگی۔"[3]

عبدالوہاب عزام کے بعد جس مصری ادیب نے اقبال پر مفید کام کیا ہے وہ پروفیسر ڈاکٹر حسین مجیب مصری ہیں جو تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں عربی اور فارسی کے کئی شعری مجموعوں کے علاوہ ادبی، مذہبی اور تاریخی کتب بھی شامل ہیں۔ وہ عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی اور انگریزی کے ایک اچھے عالم و فاضل اور مترجم ہونے کے علاوہ اردو سے بھی کما حقہ واقف ہیں۔ عربی فارسی اور ترکی ادب کے تقابلی مطالعہ کے علاوہ امت مسلمہ کی قدیم و جدید اہم شخصیات اور مصلحین پر فاضلانہ مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔

کلام اقبال سے پروفیسر حسین کو والہانہ شغف ہے۔ انھوں نے کلام اقبال کا منظوم ترجمہ موجود ہونے کے باوجود نئے سرے سے جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ فی السماء، ارمغان حجاز کا ھدیۃ الحجاز اور گلشن راز جدید کا روضۃ الاسرار کے نام سے کیا۔ یہ سارے منظوم تراجم قاہرہ سے چھپ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان تراجم کے علاوہ اقبال پر پروفیسر حسین مجیب نے تین کتابیں اقبال والعالم العربی، اقبال والقرآن اور اقبال بین المصلحین الاسلامیین بھی لکھی ہیں۔ اس مضمون میں اقبال پر پروفیسر حسین مجیب کے ان خیالات پر گفتگو کی جائے گی جو انھوں نے اپنی کتاب اقبال والعالم العربی میں پیش کیے ہیں

عربوں میں اقبال کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اقبال کے اشعار و افکار کی اہم ترین اساس اسلام ہے اور عربوں سے اسلام کا براہ راست تعلق ہے اور اسی حوالے سے اقبال نے ان کے دین و مذہب، تہذیب و تمدن، شعر و ادب، فلسفہ و کلام اور تاریخ و ثقافت سے بڑا اثر قبول کیا ہے اور ان تمام چیزوں کو اپنی نظم و نثر میں جا بجا جگہ دی ہے۔ عرب جب کلام اقبال

اقبال اور دنیائے عرب

از
ڈاکٹر بدرالدین بٹ۔ کوئل۔ پلوامہ۔ کشمیر

ڈاکٹر اقبال کی برابر یہ خواہش رہی کہ کاش وہ عربی میں شعر کہہ سکتے لیکن ان کا یہ ارمان پورا تو نہیں ہو سکا[1] مگر ان کے فارسی اور اردو کلام کو منظوم اور منثور ترجموں کے ذریعہ عربوں تک پہنچایا گیا جس سے ایک حد تک تلافی مافات ہوئی۔

اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کا سلسلہ ۱۹۴۶ء سے ہی شروع ہوا جب مرکزی بزم اقبال حیدرآباد دکن نے الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال کے نام سے ایک کتاب شایع کی جس کی اشاعت دوم کراچی سے ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔[2] اس کے بعد اقبال کے کلام کے ترجموں اور ان پر مستقل تصانیف کا آغاز ہوا جو ابھی تک جاری ہے اور آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ اقبال شناسی کی کاوشیں آیندہ بھی جاری رہیں گی۔

دنیائے عرب میں اقبال کی شاعری اور افکار کو عام کرنے میں سب سے پہلے مرحوم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے مربوط طور پر کام کیا۔ انھوں نے نہ صرف کلام اقبال کا منظوم ترجمہ کیا بلکہ اقبال کی حیات، شعر و فلسفہ اور ادب پر بھی کتابیں اور مقالے لکھے جو عرب قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ڈاکٹر عزام کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر عزام کی خدمت اسلام و ادب کی ایک بڑی خدمت ہے جو ہر قدر دانی اور شکر و اعتراف کی مستحق ہے یہ اقبال کی خوش نصیبی

تھی کہ انھیں عزام سا ترجمان ملا۔ اقبال کی روح ان کی اس محنت و محبت پر یقیناً بہت مسرور ہوئی ہوگی"۔[3]

عبدالوہاب عزام کے بعد جس مصری ادیب نے اقبال پر مفید کام کیا ہے وہ پروفیسر ڈاکٹر حسین مجیب مصری ہیں جو تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں عربی اور فارسی کے کئی شعری مجموعوں کے علاوہ ادبی، مذہبی اور تاریخی کتب بھی شامل ہیں۔ وہ عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی اور انگریزی کے ایک اچھے عالم و فاضل اور مترجم ہونے کے علاوہ اردو سے بھی کماحقہ واقف ہیں۔ عربی فارسی اور ترکی ادب کے تقابلی مطالعہ کے علاوہ امت مسلمہ کی قدیم و جدید اہم شخصیات اور مصلحین پر فاضلانہ مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔

کلام اقبال سے پروفیسر حسین کو والہانہ شغف ہے۔ انھوں نے کلام اقبال کا منظوم ترجمہ موجود ہونے کے باوجود نئے سرے سے جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ فی السماء، ارمغان حجاز کا ھدیۃ الحجاز اور گلشن راز جدید کا روضۃ الاسرار کے نام سے کیا۔ یہ سارے منظوم تراجم قاہرہ سے چھپ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان تراجم کے علاوہ اقبال پر پروفیسر حسین مجیب نے تین کتابیں اقبال والعالم العربی، اقبال والقرآن اور اقبال بین المصلحین الاسلامیین بھی لکھی ہیں۔ اس مضمون میں اقبال پر پروفیسر حسین مجیب کے ان خیالات پر گفتگو کی جائے گی جو انھوں نے اپنی کتاب اقبال والعالم العربی میں پیش کیے ہیں

عربوں میں اقبال کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اقبال کے اشعار و افکار کی اہم ترین اساس اسلام ہے اور عربوں سے اسلام کا براہ راست تعلق ہے اور اسی حوالے سے اقبال نے ان کے دین و مذہب، تہذیب و تمدن، شعر و ادب، فلسفہ و کلام اور تاریخ و ثقافت سے بڑا اثر قبول کیا ہے اور ان تمام چیزوں کو اپنی نظم و نثر میں جا بجا جگہ دی ہے۔ عرب جب کلام اقبال

پڑھتے ہیں تو انھیں نہ صرف اپنا ماضی یاد آتا ہے بلکہ وہ اپنی تاریخ کے ان نخلستانوں میں کھو جاتے ہیں جن میں انھوں نے انسانیت، علم و فن، تہذیب و تمدن، سائنس اور علوم طبیعہ کے چار چاند لگائے تھے۔

اقبال کو سرزمین حجاز سے عشق ہے اور ان کے خیال میں وہاں کی مٹی کا ذرہ ذرہ عشق سے معمور ہے۔ اسی عشق کی بدولت انھوں نے رموز بے خودی میں حجاز ہی میں موت آنے اور دفن ہونے کی تمنا کا اظہار کیا ہے[۴]۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے شرح ضرب کلیم میں لکھا ہے کہ اقبال نے مجھے بتایا کہ "مجھے عربوں سے غیر معمولی محبت ہے کیونکہ یہ لوگ سرکار دو عالمؐ سے نسبت رکھتے ہیں، عربی بولتے ہیں، وہ زبان جس میں حضورؐ تکلم فرماتے تھے"[۵]۔

پروفیسر حسین مجیب نے سب سے پہلے جاوید نامہ پر گفتگو کی ہے اور طاسین محمدؐ کے تحت محمد عربیؐ کے دشمن جان ابوجہل کی روح کے کعبہ میں ماتم کناں ہونے پر لکھا ہے۔ ابوجہل دین محمدیؐ کو عرب مظاہر پرستی، قریشی عصبیت و قومیت کے بتوں کو پاش پاش کرنے والا دین بتلاتے ہوئے نوحہ کرتا ہے:

سینۂ ما از محمد داغ داغ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ از دم او کعبہ را گل شد چراغ
ساحر و اندر کلامش ساحری است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ این دو حرف لا الہ خود کافری است
پاش پاش از ضربتش لات و منات ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ انتقام از وے بگیر اے کائنات
دل بغائب بست و از حاضر گسست ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ نقش حاضر را فسون او شکست
دیدہ بر غائب فرو بستن خطا ست ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ آنچہ اندر دیدہ می ناید کجا ست
پیش غائب سجدہ بردن کوری است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ دین نو کور است و کوری دوری است
خم شدن پیش خدائے بے جہات ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بندہ را ذوقے نبخشد این صلوات[۶]

اسلام سے قبل عرب بت پرستی، قومی عصبیت، تنگ نظری، ظلم و جبر اور طبقاتی کشمکش کی لعنتوں میں گرفتار تھے، اسلام نے ان کو یکسر ختم کر دیا اور انھیں غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے دلوں سے شکوک و شبہات کے بادل چھٹ گئے۔ ان کی روح و عقل میں وہ پاکیزگی، پختگی اور صلابت آگئی کہ اونٹوں کے گلہ بان اقوام عالم کے گلہ بان ہوگئے اور انھوں نے دنیا کی عظیم ترین تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی جہاں ملک و نسب اور قریشی و غیر قریشی کا فرق ختم ہوگیا۔ امیر و غریب کی دوئی غائب ہوگئی، غلام و آقا ایک ہی دسترخوان پر کھانا تناول کرتے تھے رنگ و نسل اور عرب و عجم کا امتیاز حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ابوجہل کی روح چیخ اٹھتی ہے:۔

مذہب او قاطع ملک و نسب ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ از قریش و منکرِ فضلِ عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ با غلام خویش بر یک خواں نشست
قدر احرارِ عرب نشناختہ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمران با سودان آمیختند ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ آبروے دودمانے ریختند
این مساوات این مواخات عجمی است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ رستخیزے بر عرب آوردہ است
عجمی را اصل عدنانی کجا ست ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ گنگ را گفتار سحبانی کجا ست[۷]

پروفیسر حسین مجیب نے حلاج کے متعلق اقبال کے خیالات پر بھی بحث کی ہے۔ حلاج دوسرے صوفیہ کے برعکس اپنے خیالات و مشاہدات کو عوام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا مگر اقبال کے خیال میں حلاج کے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ خدا نیک انسان کے قلب میں ہے نتیجتاً ایک نیک انسان خدا کو دنیا کے سامنے عیاں کرتا ہے عبد و معبود باہم دگر مربوط ہوتے ہیں اور ایک حیات اختیار کرتے ہیں شاعرانہ تخیل سے عاری فقہا نے حلاج کو غلط سمجھا اور اسے موت کے گھاٹ اتروا دیا[۸]۔ مگر اقبال حلاج کے نقطۂ نظر

کا دفاع کرتے ہیں اور ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں :۔

کم بگو از خواجۂ اہل فراق   تشنہ کام و از ازل خونیں ایاق
ما جہول و عارف بود و نبود   کو ز او این راز را بر ما کشود
از فتادن لذت بر خاستن   عیش افزودن ز درد کاستن
عاشقی مردن او وا سوختن   سوختن بے نار او نا سوختن
زانکہ او در عشق و خدمت آدم است   آدم از اسرار او نا محرم است
چاک کن پیراہن تقلید را   تا بیاموزی از و توحید را (۹)

پروفیسر حسین مجیب کے خیال میں ان اشعار سے اقبال کی آزادئ فکر ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس سے ان کے اس عزم و ہمت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے اندر حق کے اظہار اور ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے پائی جاتی تھی (۱۰)۔ اقبال نے اپنی کتاب ارمغان حجاز میں جو ان کے انتقال کے چند ہی ماہ بعد منظر عام پر آئی۔ حلاج سے متعلق "انا الحق" کے عنوان کے تحت سات رباعیاں موزوں کی ہیں اقبال کے نزدیک یہ مقام کبریا ہے اگرچہ اس کے قائل کو دار کی آزمائش سے بھی گزرنا پڑے۔

پروفیسر حسین مجیب کا خیال ہے کہ حلاج کا "انا الحق" اقبال کے نظریۂ خودی کے مماثل ہے اقبال کے نزدیک انسانی خودی مقدس شے ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ فرد اور سماج اس کے عمق میں غوطہ زن ہو کر اس سے وہ قوت و حرارت حاصل کریں جو اس کے اندر مستور ہے۔ جو قوم خودی کو اپنا مطمح نظر بناتی ہے وہ دنیا کی دوسری قوموں کی امام بن جاتی ہے اس کے نزدیک تساہل یا آرام حرام ہے وہ طائر آفاق ہونے کے باوجود اپنی اصل سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ چاند اور تاروں کو مسخر کر سکتی ہے اور اسی کے ہاتھ میں دنیا کی زمام کار ہوتی ہے (۱۱)۔

با آن ملت انا الحق سازگار است   کہ از خونش نم ہر شاخسار است
نہاں اندر جلال او جلالے   کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است (۱۲)

اقبال کی تقریباً ساری شاعری پر نظریۂ خودی چھایا ہوا ہے وہ چاہتے ہیں کہ اقوام عالم اس فلسفہ کو اپنی قومی زندگی میں اپنائیں، پروفیسر حسین مجیب کے نزدیک چونکہ اقبال کا نظریۂ خودی "انا الحق" سے قریب ہے اس لیے وہ حلاج کے جرم کے منکر ہیں اور اس مذمت کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے جس کا شکار حلاج کو ہونا پڑا۔ اقبال کے نزدیک وہ قوم جو خودی میں ایمان نہیں رکھتی کافر ہے۔ اگرچہ اس نے دینداری کا لبادہ ہی کیوں نہ اوڑھ لیا ہو حلاج کے مخالفین کو خاموش کرنے کے لیے اقبال حلاج کی زبانی کہتے ہیں :۔

بود اندر سینۂ من بانگ صور   ملتے دیدم کہ دارد قصد گور
مؤمنان با خوی و بوے کافران   لا الہ گویان و از خود منکران
من بخود افروختم نار حیات   مردہ را گفتم ز اسرار حیات
من ز نور و نار او دادم خبر   بندۂ محرم گناہ من نگر (۱۳)

اقبال نے ارمغان حجاز میں شعرائے عرب سے خاص طور پر خطاب کیا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ میرے نزدیک لعل لب ہیچ و بے قیمت ہے اور نور قرآن نے جب سے میرے دل کو فروغ دیا ہے اس وقت سے میں نے شب تاریک کو سحر کر لیا ہے :۔

بگو از من نوا خوان عرب را   بہائے کم نہادن لعل لب را
از آن نورے کہ از قرآن گرفتم   سحر کردم صد ہی سالہ شب را (۱۴)

اقبال شعرائے عرب سے خطاب کرتے ہیں کہ صورت نگار بننے کے بجائے انھیں حسن معنی پر نظر رکھنی چاہیے اور اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پا لینا چاہیے اور اپنے "سوز و ساز نغمہ

سے دل مسلم کو ابھارنا چاہیے۔

تو ہم بگذار آن صورت نگاری — جو غیر از ضمیر خویش یاری
باغ ما بر آوردی پر و بال — مسلمان زادہ سوزے کہ داری (۱۵)

اقبال کو عربوں کے مصائب اور مشکلات کا کرب ستائے رہتا تھا جس سے عرب سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر دوچار تھے۔ انھیں عربوں کے اختلافات اور باہمی نزاع سے بڑا قلق ہوتا تھا اس سے ماضی میں بھی انہیں نقصان پہنچا۔ عرب ان سارے جھگڑوں سے باز رہ سکتے تھے کیونکہ اسلام نے انھیں امن و آشتی اور محبت و اتحاد سے رہنے کی تلقین کی تھی، اسی لیے اقبال عربوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اتحاد و اتفاق سے رہنے کے لیے انہیں اسلام کے ساتھ مضبوط رشتہ استوار کرنا چاہیئے وہ اس بات پر عربوں کی ملامت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اسلاف کی راہ چھوڑ کر اغیار کی پیروی شروع کر دی جس کے نتیجے میں انہیں خسران سے دوچار ہونا پڑا۔ اقبال امرائے عرب کو یاد دہانی کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار — اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو — وصال مصطفوی، افتراق بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا — محمد عربی سے ہے عالم عربی (۱۶)

ضرب کلیم کی "شام و فلسطین" والی نظم میں اقبال نے حلب پر فرنگیوں کے قبضہ اور اخلاق سوز عادات کو عام کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی نظم میں اقبال نے مسئلہ فلسطین کو بھی چھیڑا ہے اور بجا طور پر کہا ہے کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے، تو ہسپانیہ پر مسلمانوں کا حق کیوں نہیں ہے؟

رندان فرانسیس کا میخانہ سلامت — پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق — ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا

مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور — قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا (۱۷)

پروفیسر حسین مجیب نے اقبال کی اس تنقید کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو اقبال نے سامراجیوں کی ہے کہ یہ غاصب عربوں کے ساتھ ہمدردی جتلاتے ہیں مگر اصلاً ان کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ اقبال جب فلسطینی عربوں سے خطاب کرتے ہیں تو انھیں اپنے حقوق کی بازیابی اور یہودیوں سے بغاوت کرنے پر برانگیختہ کرتے ہیں کیونکہ یہ ظالم ان کے وطن عزیز کو ہڑپ کرنا چاہتے ہیں' اقبال اپنی عادت کے مطابق فلسطینیوں کی توجہ قرون اولی کے مسلمانوں کی طرف منعطف کرتے ہیں جن کے زور ایمان نے تاریخ کے رخ کو اپنی مرضی کے مطابق موڑا، یہ لوگ عزم صمیم اور جوش و جذبہ کی حرارت سے معمور تھے یہی حرارت اور آگ فلسطینی عربوں کے دلوں میں بھی شعلہ بار ہونی چاہیئے۔(۱۸) اقبال کے نزدیک لندن اور جینیوا کی کانفرنسیں بالکل بے کار ہیں اور ان سے مسئلہ کا کوئی حل نکلنے والا نہیں کیونکہ فرنگ کی رگ جان یہود کے پنجہ میں ہے :-

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ — میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جینیوا میں ہے نہ لندن میں — فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات — خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے (۱۹)

اقبال عربوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ انھیں دنیا میں عزت و آبرو کا مقام حاصل کرنے کے لیے اسلام سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے، وہ انہیں یورپ کی نقالی سے خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سامراجی طاقتیں ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور ان میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں یہ سامراجی قوتیں عربوں کی عزت و دولت کو لوٹ لینا چاہتی ہیں اقبال عربوں کو یاد دلاتے ہیں کہ ان کی گذشتہ عظمت اسلام کی وجہ سے تھی اور انھوں نے ہی سب سے پہلے لا الٰہ الا اللہ کا انقلاب آفریں نظریہ حیات دنیا کے

سامنے پیش کر کے اقوام عالم کی رہبری کی چنانچہ پس چہ باید کرد میں نغمہ کناں ہیں۔

رمز الا اللہ کرا آموختند — این چراغ اول کجا افروختند
از دم سیراب آں امی لقب — لالہ رست از ریگ صحرای عرب
اسیر افسون فرنگی بے خبر — فتنہ ہا در آستین او نگر
از فریب او اگر خواہی اماں — اشترانش را ز حوض خود بران
حکمتش ہر قوم را بیچارہ کرد — وحدت اعرابیاں را صد پارہ کرد (۲۰)

اقبال کو عربوں کی بے چارگی پر بہت ذہنی تکلیف ہوتی ہے اور وہ انھیں اپنی تقدیر بدلنے پر ملامت کرتے ہیں مگر مایوسی کے بجائے وہ انھیں امید دلاتے ہیں کہ مصیبت کی تاریکی کے بعد راحت کی نئی روشنی پھوٹنے والی ہے:۔

اے جہان مومنان مشک فام — از تو می آید مرا بوئے دوام
زندگانی تا کجا بے ذوق سیر — تا کجا تقدیر تو در دست غیر
از بلا ترسی حدیث مصطفیٰ است — مرد را روز بلا روز صفا است (۲۱)

اقبال نے عربوں کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حسین مجیب مصری رقمطراز ہیں کہ اقبال عربوں کے ایک دردمند مورخ تھے جنھوں نے عربوں کے ماضی اور حال کے مسائل پر دل سوزی اور پوری گہرائی کے ساتھ جائزہ لے کر ان کا حل تلاش کیا ہے اور اپنی شاعری کو اپنے خیالات کا وسیلہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔(۲۲) آج کے دور میں ان ہی خیالات کی بدولت اقبال کی اہمیت اور معنویت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

حوالے

(۱) مصری حسین مجیب، پروفیسر، اقبال والعالم العربی، قاہرہ سنہ ۱۹۷۶ء ص ۱۴ (۲) کتابیات اقبال،

ترتیب رفیع الدین ہاشمی۔ پاکستان (۳) ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، نقوش اقبال، لکھنؤ سنہ ۱۹۷۲ء ص ۳۸ (۴) رموز بے خودی مع شرح یوسف سلیم چشتی، سرینگر سنہ ۱۹۷۲ء ص ۲۱۰ (۵) چشتی، یوسف سلیم پروفیسر: شرح ضرب کلیم، دہلی سنہ ۱۹۷۰ء، ص ۳۳۱ (۶) جاوید نامہ (کلیات اقبال فارسی لاہور) سنہ ۱۹۸۵ء، ص ۵۴ (۷) ایضاً: ص ۵۵ (۸) حسین مجیب، ص ۲۰ (۹) جاوید نامہ (کلیات) ص ۱۳۳ (۱۰) اقبال والعالم العربی ص ۲۰-۲۱ (۱۱) ایضاً: ص ۲۲ (۱۲) ارمغان حجاز، لاہور سنہ ۱۹۵۹ء ص ۹۷ (۱۳) جاوید نامہ (کلیات اقبال فارسی) ص ۱۲۳ (۱۴) ارمغان حجاز، ص ۱۱۴ (۱۵) ایضاً: ص ۱۱۵ (۱۶) ضرب کلیم، دہلی سنہ ۱۹۸۱ء ص ۴۳ (۱۷) ایضاً: ص ۱۵۶-۱۵۷ (۱۸) ایضاً ص ۱۳۰ (۱۹) ایضاً ص ۱۵۹-۱۶۰ (۲۰) پس چہ باید کرد (کلیات فارسی) ۳۹-۴۰ (۲۱) جاوید نامہ (کلیات فارسی) ص ۹۷-۹۸ (۲۲) اقبال والعالم العربی۔ ص ۳۶-۳۷۔

چوتھی صدی ہجری کے صوفی فقیہ

امام ابو علی دقاق

از

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

چوتھی صدی ہجری اسلامی تاریخ کا تابناک اور زریں علمی دور ہے، اس صدی میں تفسیر و حدیث و فقہ و کلام، تصوف اور شعر و ادب کے نامور فضلا اور اساطین پیدا ہوئے، ان میں بعض تو اپنی جلالت علمی کی وجہ سے یگانۂ روزگار ہوئے، امام ابوبکر سجستانی، امام ابن سریج، امام ابن خزیمہ، امام صعلوکی، امام ابو حاتم رازی، امام ابو الحسن اشعری، امام سرخسی، امام ابن الحداد، امام دارکی، امام ابوبکر قفال شاشی، امام ابو سلیمان بستی، امام دار قطنی وغیرہ ائمہ فن کا تعلق اسی عہد سے ہے۔ انہی ناموروں میں امام ابو علی دقاق شافعی نیشاپوری کی ذات گرامی بھی ہے جن کے متعلق تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ امام عصر، لسانِ وقت، فقیہ، زاہد، عارف اور شیخ الصوفیہ تھے، ان کا مرتبۂ کمال اس سے ظاہر ہے کہ وہ جامع شریعت و طریقت امام عبد الکریم بن ہوازن قشیری کے استاذ تھے، لیکن افسوس ہے کہ اس قدر اہم شخصیت کے نہ احوال تفصیل سے ملتے ہیں اور نہ ان کے ساتھ اس درجہ اعتنا کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے، تلاش و تفحص سے ان کے جو حالات مل سکے ہیں ان کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

نام و نسب ان کا نام و نسب یہ ہے، حسن بن علی بن محمد بن اسحاق بن عبد الرحیم بن احمد، ابو علی کنیت ہے، نیشاپوری، نسبت وطنی ہے، شہرت ابو علی دقاق کے نام سے ہوئی، دقاق کے متعلق امام سمعانی کی تحقیق یہ ہے کہ آٹے کی تجارت اور کاروبار کرنے والوں کو دقاق کہا جاتا تھا، یہ پیشہ بہت سے اہل علم کا ذریعۂ معاش تھا، ان میں مشہور محدث ابو القاسم عیسیٰ بن ابراہیم دقاق بھی ہیں[1]۔

حصول تعلیم امام ابو علی دقاق کے خاندانی حالات اور ابتدائی حصول علم کے واقعات بھی تذکروں میں مذکور نہیں، البتہ امام عبد الغافر کی روایت کے مطابق انھوں نے علم حدیث اور عربی زبان و ادب اور علم اصول کی تحصیل کے بعد فقہی علوم حاصل کرنے کے لیے مرو کا سفر کیا[2]۔

انھوں نے ابو عمرو بن حمدان، ابو الہیثم محمد بن مکی الکشمیہنی اور ابو علی محمد بن عمر الشبولی سے[3] حدیث کا سماع کیا، بعد میں فقہ شافعی کی تحصیل کی غرض سے مرو تشریف لے گئے، جہاں امام قفال و امام خضری جیسے ائمۂ فضل و کمال خلق خدا کو فیضیاب کر رہے تھے، سب سے پہلے وہ امام قفال مروزی متوفی ۴۱۷ھ کی مجلس فقہ سے وابستہ ہوئے[4]، بعد میں وہ امام ابو القاسم ابراہیم بن محمد خضری نیشاپوری متوفی ۳۶۷ھ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے جو اپنے زمانہ میں علوم ظاہری و باطنی دونوں کے جامع تھے، وہ شیخ شبلی اور امام ابو علی روذباری جیسے اصحاب ورع و تقویٰ کے فیض یافتہ تھے[5]، امام خضری کے انتقال کے بعد امام ابو علی دقاق پھر امام قفال مروزی کے دامن سے وابستہ ہوئے، ان دونوں ائمہ سے فیض حاصل کرنے کے بعد ان کو فقہ میں اس درجہ تبحر و کمال حاصل ہوگیا

---

[1] انساب: سمعانی ج ۱ ص ۵۰۴، اللباب باب ابن اثیر ج ۱ ص ۴۲۱ [2] طبقات الشافعیہ کبری سبکی جدید ادیشن ج ۴ ص ۳۲۹ [3] بعض جگہ محمد بن عمرو النسوی بھی ہے مگر صحیح شبولی ہے، ایضاً [4] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۹ [5] ایضاً

وہ اس میں مرجع و مرکز بن گئے اور طالبان علم کے قافلے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، حتیٰ شدت الیہ الرحال فی ذالک[1]

تصوف: ان کی علمی شہرت اگرچہ فقہ میں، ان کی کاملیت و مہارت کی رہین منت ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی سے زہد و تقویٰ، معرفت الٰہی اور صوفیانہ اذکار و اشغال سے رغبت رکھتے تھے، امام خضری سے تعلق کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ شریعت و طریقت کے جامع تھے اور شیخ شبلی و ابو علی روذباری شاگرد جنید بغدادی جیسے اکابر صوفیہ کے صحبت یافتہ تھے، اسی لیے حدیث و فقہ میں درجۂ کمال کو پہنچنے کے بعد بقول ابن عماد حنبلی وہ طریق تصوف کے سالک ہوئے اور اپنی ساری توجہ عمل و اخلاص کی جانب مرکوز کی[2]۔ امام سبکی لکھتے ہیں کہ

ولما استجمع ما یحتاج الیہ	جب اپنی ضرورت کے بقدر علوم حاصل
من العلوم اخذ فی العمل و	کر چکے تو عمل میں لگ گئے اور طریق
سلك طریق التصوف[3]	تصوف پر گامزن ہوئے،

وہ امام خضری کے واسطے سے شبلی، جنید، سری سقطی، معروف کرخی، داود طائی اور پھر تابعین تک پہنچنے والے سلسلۂ زریں سے منسلک ہوئے[4]۔ اور حال و قال دونوں اعتبار سے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئے، جس کی بنا پر ایسی شہرت نصیب ہوئی کہ ایک عالم ان سے فیضیاب ہوا چنانچہ ان کی مجلس ناموروں سے معمور تھی جن میں شیخ ابوالقاسم قشیری

[1] شذرات الذہب: ابن عماد حنبلی ج ۳ ص ۱۸۰ [2] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۸۰ [3] طبقات کبریٰ جدید بحوالہ مذکور، یہی الفاظ حافظ ابن عساکر دمشقی کے بھی ہیں دیکھیے تبیین کذب المفتری ص ۲۲۶
[4] تبیین کذب المفتری: ابن عساکر دمشقی ص ۲۰۳۔

صاحب رسالۂ قشیریہ سب سے نمایاں ہیں[1]،

امام قشیری پہلی ہی دفعہ جب ان کی مجلس میں حاضر ہوئے تو ان کے اقوال و افکار سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی آرزو ظاہر کی، امام دقاق نے ان کی یہ خواہش قبول تو کر لی لیکن یہ مشورہ دیا کہ ابھی وہ تعلیم میں اپنا وقت لگائیں، چنانچہ امام قشیری، اکتساب علم کے لیے امام ابوبکر طوسی، امام ابوبکر بن فورک اور امام ابواسحاق اسفرائنی کے حلقہ ہائے درس میں شریک ہوتے رہے لیکن وہ امام دقاق کی مجالس میں بھی برابر حاضر ہوتے رہے ان کے آثار سعادت کو دیکھ کر امام دقاق نے اپنی صاحبزادی سے ان کا عقد کر دیا۔ اس طرح شیخ و مرید کا یہ رشتہ اور مضبوط ہوا[2]۔

جلالت شان: تذکرہ نگاروں نے ان کو الاستاذ، الزاہد العارف، شیخ کبیر[3]، عارف باللہ شہیر، وحید عصر، بے مثال[4]، شیخ الاستاذ، لسان وقت اور امام عصر جیسے القاب و آداب سے یاد کیا ہے۔

ابن العماد حنبلی نے شیخ عبدالروف منادی کے یہ توصیفی کلمات نقل کیے ہیں،

کان فارھا فی العلم، متوسطاً	وہ علم میں ماہر، حلم میں میانہ رو،
فی الحلم محمود السیرۃ مجهود	خوش خصال، صاف دل، پاک نیت
السریرۃ، جنیدی الطریقہ	طریقت میں جنیدی اور حقیقت کے
سری الحقیقہ الخ[5]	سری سقطی تھے۔

امام غزالی نے لکھا ہے وہ زاہد زمانہ اور عالم وقت تھے[6]،

[1] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۹ [2] تبیین ص ۲۰۳ [3] مرآۃ الجنان: یافعی ج ۳ ص ۷، [4] العبر فی خبر من غبر حافظ ذہبی ج ۳ ص ۹۳ [5] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۸۰ [6] ایضاً۔

قاضی ابن شہبہ نے لکھا ہے کہ وہ صاحب کرامات و مکاشفات تھے[1]، انھوں نے اگرچہ کسی کرامت کا ذکر نہیں کیا، تاہم امام قشیری کی ایک روایت سے امام دقاق کی فراست اور کشف کا اندازہ ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ امام دقاق سے میرے تعلق کی ابتدار کا زمانہ تھا اس وقت میں مسجد مطرز میں درس دیا کرتا تھا، مجھے نسا (نیشاپور اور مرو کے درمیان کی ایک بستی) جانا تھا، جانے سے پہلے میں امام دقاق کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا، اس وقت دل میں خیال آیا کہ کاش میری غیر موجودگی میں وہ میری مجلس کو سرفراز کر دیا کریں، میں اسی وقت وہ میری جانب مڑے، اور فرمایا کہ تمھاری غیر حاضری میں میں تمھاری قائم مقامی کر دیا کرونگا، چند قدم چلنے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ وہ علیل ہیں، اور ہفتہ میں اگر وہ دو تین بار میری مجلس میں آئیں گے تو زحمت ہوگی، اس لیے اگر وہ ایک ہی بار آجائیں تو بہتر ہو، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر رکے اور فرمایا کہ اگر ہفتہ میں دو بار ممکن نہ ہوا تو میں ایک ہی بار آجاؤں گا، اسکے بعد پھر میرے دل میں کوئی بات آئی اور انھوں نے از خود اس کے متعلق جواب دے دیا۔[2]

اقوال و احوال فقہ شافعی میں ان کے فضل و کمال اور ان کی ذات کے مرجع و مرکز ہونے کا ذکر تو کیا گیا مگر افسوس ہے کہ ہم ان کی کسی فقہی کتاب یا ان سے منقول مسائل و فتاوی کے مجموعہ سے ناواقف ہیں، اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ ان کی فقہی حیثیت پر ان کی صوفیانہ شان غالب تھی، تاہم ان کے بعض اقوال کتابوں میں موجود ہیں، ہم ذیل میں حکمت و معرفت کے ان چند موتیوں کو ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "اُذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ" (مجھے یاد کرو میں تم کو

[1] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۸۰ و طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۹ [2] تبیین کذب المفتری ص ۲۲۶۔

یاد رکھوں گا) اس کی تشریح میں امام دقاق نے فرمایا کہ مجھے یاد کرو جبکہ تم زندہ ہو میں تمھیں اس وقت یاد رکھوں گا جب تم مر چکے ہوگے، اور زیر خاک ہوگے اور تمھارے احباب و اقارب اور سارے ساتھی اور سہارے تم سے چھوٹ چکے ہوں گے[1]

حدیث شریف ہے کہ "من اکرم غنیا لغناہ ذھب ثلثا دینہ" (جس نے کسی مالدار کی محض اس کی ثروت و تونگری کی وجہ سے عزت و تکریم کی اس کا دو تہائی دین ضایع ہو گیا) اس کی تشریح میں فرمایا کہ انسان تین حیثیتوں سے جانا جاتا ہے، ایک قلب، دوسرے زبان اور تیسرے نفس، تو اگر کسی کی ثروت کے سامنے زبان و نفس سے خود کو حقیر ثابت کیا تو اس کے دین کا دو تہائی حصہ ضایع ہو گیا اور اگر مالدار کی بالمعاری کا زبان و نفس کے ساتھ دل سے بھی معترف و مقر ہوا تو پھر اس کا تمام کا تمام دین جاتا رہا[2]

ایک اور حدیث شریف ہے کہ "حفت الجنۃ بالمکارہ" (جنت، مکروہات سے گھیری گئی ہے) اس کی تشریح میں انھوں نے یہ نکتہ پیش کیا کہ جنت خالق کائنات کی قدرت و خلقت کا ایک مظہر ہے، جب اس تک رسائی، مشقتوں اور دشواریوں کے بعد ہی ممکن ہے تو پھر خدائے نعم میزل تک رسائی کتنی دشواریوں اور مشقتوں کے بعد ہوگی[3]

ایک اور حدیث شریف کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں کہ "جبلت القلوب علی حب من احسن الیھا" (حسن سلوک کرنے والے کی طبعی محبت لوگوں کے دلوں میں رکھ دی گئی ہے) اس کے متعلق فرمایا کہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو اللہ کے علاوہ کسی اور کو محسن نہیں سمجھتے پھر بھی وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ امام ابن اثیر نے اس قول کو بہت خوب

[1] البدایہ والنہایہ: ابن کثیر دمشقی ج ۱۲ ص ۱۳ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۳ و طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۴۰ [3] البدایہ والنہایہ بحوالۂ مذکورہ۔

بتایا ہے، گرچہ حدیث کی صحت میں کلام کیا گیا ہے[1]

ایک مرتبہ ان کی خدمت میں ایک صاحب ریاست امیر آئے اور ان کے سامنے دوزانو ہو کر نصیحت کے طالب ہوئے، امام دقاق نے فرمایا کہ پہلے میرے ایک سوال کا جواب صدق واخلاص سے دیجئے کہ آپ کو دولت زیادہ محبوب ہے یا دشمن؟ جواب دیا کہ دولت، تو فرمایا کہ کیسے، جس سے تم کو محبت ہے، اسکو اپنے بعد یہیں چھوڑ جاؤگے جبکہ تمہارا دشمن جس کو تم پسند نہیں کرتے ہو وہ تمہارے ساتھ رہے گا، یعنی اپنے دشمن سے محبت کرو کہ آخرت میں یہ باعثِ اجر ہو[2]۔ یہ سن کر وہ امیر کبیر رو دئے اور کہا کہ کیا خوب نصیحت ہے[2]

ایک بار فرمایا کہ جو شخص حق بات کے اظہار میں سکوت اختیار کرے وہ گونگا شیطان ہے[3]،

فرمایا کہ لقائے رب کے اشتیاق میں اگر موت کی تمنا کی جائے تو اس وقت کی جائے جب انسان بساط عیش وعشرت پر ہو، نہ کہ آزمائش وامتحان کی گھڑیوں میں، حضرت یوسفؑ کو جب کنویں میں ڈھکیلا گیا اور جب ان کو داخل زنداں کیا گیا تب انھوں نے توفنی (اے اللہ مجھے اپنے پاس بلالے) کی دعا نہیں کی لیکن جب وہ عیش وعشرت کی نعمتوں سے سرفراز ہوئے تو فرمایا کہ توفنی مسلما،[4]

فرماتے تھے کہ صاحب الحزن (درد مند دل والے) ایک ماہ میں طریق معرفت کی جو مسافت طے کر لیتے ہیں دوسرے اسے ایک برس میں بھی نہیں کر سکتے[5]

فرمایا کہ جس نے آداب اسلام میں کسی کو بھی حقیر ومعمولی خیال کیا وہ سنت سے محروم ہوا اور جس نے کسی سنت کو ترک کیا، اسے ادائے فرض سے محرومی کی سزا ملی اور

---

[1] البدایہ والنہایہ بحوالہ مذکورہ [2] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۸۰ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً۔

جس نے فرائض کو اہمیت نہ دی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک مبتدع مقرر کر دیتے ہیں جو اس کے پاس باطل کا ذکر کرتا ہے اور اس طرح وہ اس شخص کے قلب میں شک وریب کی تخم ریزی کرتا ہے،[1]

فرمایا کہ لوگ بحث کرتے ہیں کہ ثروت وعلم میں کون افضل ہے؟ میرے نزدیک سب سے بہتر یہ ہے کہ انسان کو بقدر کفاف مال حاصل ہو اور پھر وہ اسی میں محفوظ رہے[2] وہ یہ اشعار اکثر پڑھتے تھے،

احسنت ظنک بالایام اذ حسنت — ولم تخف شر ما یاتی به القدر[3]

وسالمتک اللیالی فاغتررت بها — وعند صفو اللیالی یحدث الکدر

(وقت اگر سازگار وخوشگوار ہے تو خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہو، حالانکہ قضا وقدر کی ناگوار باتیں مخفی نہیں ہیں، شب وروز بے خطر ہیں تو تم کو ان سے دھوکہ نہ ہو کہ ہر صبح کی شام اور ہر چاندنی کے بعد اندھیری رات ہے۔)

سماع کے متعلق ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ سماع عوام کے لیے حرام ہے کہ ان کے نفوس سیئہ کی بقا کا سامان ہے، زاہدوں کے لیے یہ مباح ہے کہ مجاہدوں کے حصول میں مددگار ہے اور ہمارے اصحاب کے لیے یہ مستحب ہے کہ ان کے دلوں کی حیات کا سبب ہے[4]

فرمایا کہ اگر کسی شہر سے کسی صاحب دل، اللہ کے ولی کا گذر ہوتا ہے تو اس کے برکات شہر والوں کو حاصل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ یہ برکتیں کسی عامی وجاہل کے لیے باعثِ مغفرت ہو جاتی ہیں،[5]

---

[1] طبقات کبریٰ جدید ج ۴ ص ۳۳۰ [2] طبقات کبریٰ جدید بحوالہ مذکورہ [3] شذرات الذہب بحوالہ مذکورہ [4] ایضاً [5] ایضاً۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ کسی شخص نے جناب سہل سے ہمہ وقت معیت کی خواہش ظاہر کی، جناب سہل نے فرمایا کہ جب ہم میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو باقی رہنے والے کے ساتھ کون رہتا ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ اللہ! فرمایا کہ بس اسی کی مصاحبت و رفاقت اختیار کرو[۱]۔ فرمایا کہ یہ بڑی آزمائش ہے کہ تم محض مرید بن کر رہو، مراد نہ بن سکو، تم قربت کے آرزو مند ہو اور تم کو مبتلائے ہجر و فراق رکھا جائے[۲]۔

ایک بار جب وہ تلاوت کے دوران اس آیت کریمہ پر پہنچے (فتولی عنہم وقال یا اسفی علی یوسف (برادران یوسف سے منہ پھیرا اور فرمایا آہ غم یوسف) تو یہ شعر پڑھا

جننا بلیلی وھی جنت بغیرنا — واخری بنا مجنونۃ لا نریدھا[۳]

امام دقاق کے ان اقوال کی تاثیر میں ان کے احوال کا بڑا دخل ہے، وہ عیش و عشرت کی زندگی کے بالکل عادی نہ تھے، بقول امام قشیری، وہ مسند و تکیہ پر ٹیک تک نہ لگاتے تھے[۴]۔

وفات ذی الحجہ ۴۰۶ھ میں وہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، ابن تغری بردی[۵] نے سال وفات ۴۱۲ھ لکھا ہے مگر دوسرے تذکرہ نگاروں نے ۴۰۶ھ کو ہی ترجیح دیا ہے۔

۱؎ تشذرات الذہب بحوالہ مذکورہ ۲؎ البدایہ والنہایہ بحوالہ مذکورہ ۳؎ ایضاً ۴؎ تبیین بحوالہ مذکورہ ۵؎ النجوم الزاہرہ بحوالہ طبقات کبری جدید ج ۴ ص ۲۳۰۔

مطلقہ عورت اور نان نفقہ

از حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی

قیمت: ۱۰ روپے

"منیجر"

نجیب محفوظ

مصر کا مشہور ناول نگار

از

جناب شیخ نذیر حسین، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

الفریڈ نوبل[۱] (م ۱۸۹۶ء) سویڈن کا مشہور سائنس داں اور ڈائنامیٹ (بم) کا موجد تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے دھماکہ خیز گولے بھی ایجاد کیے تھے ان ہلاکت خیز ایجادات کے صلے میں یورپی ممالک نے اسے گرانقدر انعامات سے نوازا تھا۔ مزید براں نوبل کی باکو (روس) میں تیل کے کنوؤں میں شراکت داری تھی، لہذا اس نے بے حساب دولت جمع کرلی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں ایک ٹرسٹ قائم کر کے کروڑوں پونڈ اس کی تحویل میں دیدیے تھے اور یہ وصیت کر دی تھی کہ اس رقم کے منافع سے ہر سال سائنس میں نئی دریافت کرنے والے سائنس داں یا علم و ادب کی غیر معمولی خدمت کرنے والے ادیب کو اس کے نام سے موسوم انعام دیا جائے۔ اس انعام کی مالیت دس ہزار پونڈ سے لے کر تیس ہزار پونڈ ہوتی ہے، یورپ اور امریکہ کے فضلاء اور ماہرین سائنس ہمیشہ نوبل انعام سے سرفراز ہوتے رہے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں یہ اعزاز صرف رابندر ناتھ ٹیگور اور چندر شیکھر[۲] وینکٹا رامن (مدراس یونیورسٹی) کو حاصل ہوا تھا، لیکن اب تک کوئی بھی مسلمان اس انعام کا مستحق نہیں سمجھا گیا تھا،

۱؎ Alfred Nobel ۲؎ C.V.RAMAN-

آج سے بیس سال قبل بعض یورپی ارباب علم نے نوبل انعام کے لیے مشہور مصری مصنف اور ادیب طٰہٰ حسین کا نام پیش کیا تھا لیکن یہودی و عیسائی کارپردازوں کے روایتی تعصب کی وجہ سے یہ تجویز منظور نہ ہو سکی۔ خوشی کی بات ہے کہ اب یہ انعام مشہور مصری ناول نگار نجیب محفوظ[1] کو عطا کیا گیا ہے، جس کے بہت سے ناول انگریزی و فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

نجیب محفوظ ۱۹۱۲ء میں قاہرہ میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوا، جو جمالیہ کے محلے میں رہائش پذیر تھا۔ اس محلے کو نجیب کے ناولوں میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ نجیب نے جامعہ مصریہ میں تعلیم پائی اور ۱۹۳۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ جامعہ مصریہ کے انتظامی شعبے سے متعلق ہو گیا۔ ازاں بعد وہ پندرہ (۱۵) برس تک وزارت اوقاف میں کام کرتا رہا۔ اس کے ذمے مساجد کی نگرانی اور مختلف انتظامی امور تھے۔ اس ملازمت کے دوران اس کو مختلف لوگوں سے ملنے اور دینی حلقوں کے خیالات اور رجحانات سے شناسا ہونے کے مواقع ملے۔ وہ محکمہ کے کلرکوں، منشیوں اور مختلف اہل کاروں کی تنگ نظری، کام چوری، تساہل پسندی اور تاخیری حربوں سے نالاں رہا۔

۱۹۵۴ء میں نجیب محفوظ کی تبدیلی وزارت ثقافت میں بطور ڈائرکٹر ٹیکنیکل ایجوکیشن ہو گئی، جس کے ذمے صنعتی (فنی) اسکولوں کی نگرانی تھی۔ اس کے بعد وہ سینماؤں کی تنظیم (موسسۃ السینما) کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں مصری حکومت نے اسے علم ادب کی خدمت کے صلے میں اعلیٰ سرکاری انعام سے نوازا۔ ۱۹۷۲ء میں اس نے سرکاری مناصب سے سبکدوشی حاصل کر کے اپنی دنیا آپ بسانی شروع کر دی۔

نجیب نے چالیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اس کی پرائیوٹ زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہے۔ وہ اب خاموشی سے تصنیف و

---

[1] -NAGUIBMAFOUZ

تالیف میں لگا رہتا ہے اور روزآنہ چار پانچ گھنٹے لکھنے، پڑھنے میں گذارتا ہے۔ بعض اوقات وہ دو مختلف کتابوں کی تحریر میں مصروف رہتا ہے۔ الاہرام میں اس کے ناول، قصے، کہانیاں اب بھی قسط وار چھپتے رہتے ہیں۔

نجیب کی ادبی زندگی تقریباً پچپن (۵۵) برس پر محیط ہے۔ وہ ملازمت کے ساتھ ادبی کاموں میں بھی مصروف رہا ہے۔ وہ موجودہ عرب دنیا کا معروف ترین، بسیار نویس اور زود نویس اور کامیاب مصنف ہے۔ اس نے چوبیس پچیس کے قریب ناول اور سیکڑوں افسانے لکھے ہیں۔

نجیب نے زمانۂ تعلیم میں مصر قدیم پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ مصر القدیمہ کے نام سے کیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے سلامہ موسیٰ[1] کی تحریک اور ترغیب و تشویق پر اس کے ہفتہ وار میگزین مجلۃ الاسبوعیۃ الجدیدہ میں افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ اس کے بعد اس کے ناول مصر کے مختلف روزناموں، ہفت ناموں اور ماہناموں میں قسط وار شایع ہوتے رہے۔ افسانوں کی تعداد کوئی چار، پانچ سو کے لگ بھگ ہے۔

نجیب مصری ادیبوں میں طٰہٰ حسین، عباس محمود العقاد اور احمد حسن الزیات سے بھی متاثر رہا ہے، لیکن سلامہ موسیٰ کی صحبتوں میں اس پر جو رنگ چڑھ چکا تھا وہ آج تک اتر نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ نجیب کو مصر کے فرعونی عہد کی تاریخ و تمدن سے شغف رہا ہے اس کے ابتدائی تین ناول فراعنہ مصر کے عہد سے متعلق ہیں۔ وہ مصری قوم پرستی کی تحریک کا بھی ہمنوا رہا ہے۔

نجیب نے یورپی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے روسی برطانوی اور فرانسیسی ادیبوں

---

[1] سلامہ موسیٰ ایک قبطی عیسائی ادیب تھا جس کی اباحیت..... سے مصر کے اسلامی اور دینی حلقوں کو شدید اختلاف تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح، التربیۃ کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

کی تحریروں کو بڑے غور اور انہماک سے پڑھا ہے۔ ٹالسٹائی، دوستوفسکی، والٹر سکاٹ اور دوسرے فرانسیسی ادبا، اس کے محبوب مصنف ہیں۔

نجیب کے ناولوں کے پلاٹ اور ان کا تانا بانا الف لیلہ کی داستانوں سے ملتا جلتا ہے، وہ قاہرہ کے قدیم محلوں کے رہنے والوں کی معاشرتی زندگی، ان کے رسم و رواج، ان کے احساسات و جذبات اور رجحانات و میلانات کی نہایت خوبصورتی سے ترجمانی کرتا ہے، خان الخلیلی، زقاق المدق، بین القصرین، قصر الشوق، اولاد حارتنا، السکریہ اور اللص والکلاب اس کے مقبول ترین ناول ہیں۔ خان الخلیلی، زقاق المدق قاہرہ کے قدیم محلوں کے نام ہیں، جہاں کے باشندوں کے طور طریقوں اور رہن سہن پر آج بھی مملوک عہد کا سایہ چھایا ہوا ہے اور وہ جدید تمدن کے بہت سے مظاہر سے ناآشنا ہیں۔ بدایۃ والنہایۃ مصر کی تحریک آزادی کی داستان ہے۔ اللص والکلاب (چور اور کتے) میں ایسے ڈاکو کو پیش کیا گیا ہے۔ جو بد عنوان معاشرے سے بیزار ہو کر امیروں کے ہاں چوری کرتا اور ناداروں کی مدد کرتا ہے۔ اس ناول کو فلمایا بھی جا چکا ہے۔

نجیب محفوظ ایک آزاد خیال اور ترقی پسند ادیب ہے۔ شاید اس کا ایک ناول مصری حکومت ضبط بھی کر چکی ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے زبان و بیان پر بھی اعلیٰ قدرت حاصل ہے اور وہ حتی الامکان عامی زبان سے پرہیز کرتا ہے۔

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَاد

المرتضیٰ (عربی، اردو)

مولفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات عربی ۲۸۴ مع خوبصورت ڈسک کور، صفحات اردو ۳۴۶ مجلد مع گرد پوش قیمت اردو اعلیٰ ایڈیشن ساٹھ ۶۰ روپیے اور عام ایڈیشن ۴۵ روپیے، پتہ عربی: دار القلم دمشق، حلبونی پوسٹ بکس ۴۵۲۳، بیروت، پوسٹ بکس ۶۵۰۱/۱۱۳ پتہ: اردو ایڈیشن مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ۔

طبقات صحابہ اور تاریخ اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب کا تذکرہ موجود ہے، دار المصنفین کے سلسلۂ سیر الصحابہ و تاریخ اسلام میں بھی اسی حیثیت سے انکے حالات و کمالات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، لیکن حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح ان کی علحدہ اور مفصل سوانح عمری لکھنے کا اہتمام نہیں کیا گیا اور قدیم طرز کی کتابوں میں صحت و وثوق کا لحاظ کیے بغیر افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، اس کی وجہ سے حضرت علی مرتضیٰؓ کی شخصیت کے حقیقی خط و خال اور اصلی تصویر دنیا کے سامنے جلوہ گر نہ ہو سکی اس لیے ان کی ایسی مستند سوانح عمری کی ضرورت تھی جو موجودہ علمی و تحقیقی ذوق و معیار کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو اور اس میں بحث و نظر اور تلاش و تحقیق کا موضوعی انداز اختیار کرکے مثبت حقائق اور درست نتائج تک پہنچنے کی سعی بلیغ کی گئی ہو،

اردو و عربی کے نامور مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دوسرے متعدد علمی و دینی کاموں کی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی توفیق دی، اور انھوں نے عربی میں سیرت مرتضوی پر یہ مفید کتاب لکھی

جس کے اردو ترجمہ کی سعادت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے حصہ میں آئی جو اردو و عربی کے پختہ مشق اہل قلم اور اچھا علمی و ادبی ذوق رکھنے کے علاوہ اسی موضوع اور اس کی مرکزی شخصیت اور اس کے خاندان ہی سے نہیں بلکہ خود فاضل مصنف سے بھی عقیدت و احترام کا تعلق رکھتے ہیں،

المرتضیٰ دس ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں حضرت علیؓ کے خاندانی حالات اور عہد و ماحول کا جائزہ لے کر ان کی سیرت و شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے خاندان کا حصہ دکھایا گیا ہے اور ولادت سے ہجرت تک کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں، دوسرے باب میں مدینہ منورہ میں ان کے قیام کے زمانہ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کے حالات، مختلف غزوات میں ان کے جنگی کارنامے اور شجاعت و بہادری کے خداداد کمالات بیان کیے گئے ہیں پھر تین ابواب میں عہد صدیقی و فاروقی و عثمانی میں پیش آنے والے ان کے حالات و واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے، چھٹے باب میں خلافت مرتضوی کا ذکر ہے، اس میں خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد کی دشواریوں، مسلمانوں کے اختلاف، جنگ جمل و صفین میں ان کی باہمی خوں ریزی، فتنہ خوارج اور سبائیت کی تفصیل ہے، ساتویں باب میں خوارج اور اہل شام کے ساتھ پیش آنے والے حوادث، حضرت علیؓ کی شہادت، ان کے آل و اولاد کا تذکرہ ان کے حکیمانہ و عارفانہ اقوال اور شعر و ادب میں ان کے کمال کا ذکر ہے۔ آٹھویں باب میں فاتح خیبر کی پاکیزہ سیرت، زاہدانہ و متوکلانہ زندگی، عمال و حکام کے ساتھ برتاؤ اور اصول سیاست و طرز حکمرانی وغیرہ پر گفتگو ہے، نویں باب میں حضرات حسنینؓ کی سیرت و کردار کے جلوے دکھائے ہیں اور ان کے دینی و سیاسی موقف پر بحث کی ہے، دسویں باب میں اہل بیت اور اولاد علیؓ کی سیرت و کارنامے بیان کیے ہیں اور فرقہ امامیہ کے نظریہ امامت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کی زندگی کے بعض موڑ بڑے نازک اور پیچیدہ ہیں، اس طرح کے بعض نازک مباحث و مسائل پر مصنف نے بڑی فاضلانہ بحث کی ہے،

۱۔ مسلمانوں میں امامت و خلافت کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اسی کی وجہ سے امت ڈو بڑے فرقوں میں بٹ گئی، مولانا نے اثنا عشری فرقہ کے عقیدہ امامت کو مختلف اسباب و عوامل کا نتیجہ بتایا ہے اور دقت نظر سے اس کا تجزیہ کرکے کئی اہم پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی ہے، جس کا لب لباب یہ ہے،

شروع میں اہل بیت توحید و رسالت کے بنیادی عقیدہ پر خود بھی قائم و استوار رہے اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دیتے رہے ان کے نزدیک رسول اللہؐ خاتم النبیین تھے، آپؐ کے بعد دین ہر اعتبار سے مکمل ہوگیا اس لیے وحی و رسالت کا سلسلہ موقوف ہوگیا اور اب دین میں کسی کمی بیشی اور رد و بدل کی گنجایش باقی نہیں رہی۔ مگر بعد میں ان کے اندر قدیم جاہلیت کی روح عود کر آئی اور وہ یونان، ایران، ہندوستان اور چین کے نبوت سے ناآشنا یا اپنی اصل تعلیمات پر قائم نہ رہنے والے مذاہب کی طرح اس بات کے قائل ہوگئے کہ حکمراں طبقہ اور روحانی و باطنی قیادت اور نسلی و موروثی وجاہت کے مالک خاندان دوسرے لوگوں سے ممتاز اور عام سطح سے بلند نیز مقدس و معصوم ہوتے ہیں۔ اور انہیں شریعت میں رد و بدل، تحلیل و تحریم اور قانون سازی کا حق و اختیار ہوتا ہے۔

مصنف نے اثنا عشری فرقہ کی مستند کتابوں کے حوالہ سے اس کے عقیدہ امامت پر بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ اس کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء و ائمہ کا تعین من جانب اللہ ہوتا ہے اور وہ پیغمبروں کی طرح معصوم اور مفترض الطاعت ہوتے ہیں، عام لوگ تو درکنار دوسرے انبیاء علیہم السلام سے بھی ان کا درجہ بڑھا ہوا ہے البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہے، نہ ائمہ کے بغیر لوگوں پر خدا کی حجت قائم اور تمام ہوسکتی ہے اور نہ دنیا قائم رہ سکتی ہے ان کی معرفت ایمان کے لیے شرط ہے، ان کو تحلیل و تحریم اور تشریع کا مکمل اختیار ہے، ان پر ایمان لانے والا جنتی ہے خواہ وہ ظلم، فسق اور فجور ہی کا مرتکب کیوں نہ ہو،

مولانا کے خیال میں یہ اور اسی قسم کے دوسرے عقائد اثنا عشری فرقہ میں نسلاً بعد نسلٍ برابر موجود

ملتے ہیں جس کی صدائے بازگشت اس زمانے کے مشہور شیعی رہنما امام خمینی کی تقریروں اور تحریروں میں بھی سنائی دیتی ہے، مولانا کے نزدیک مخصوص خاندان وافراد کی عصمت وتقدس کے اس تصور اور غلو پر مبنی امامت کے اس عقیدہ کے حدود الوہیت تک پہنچ گئے ہیں اور اس پر قدیم ایرانی عقائد کی وہی چھاپ نظر آتی ہے جس نے اونچی ذات کے لوگوں کو ظل الٰہی بنا دیا اور حکمراں خاندان وافراد کے بارہ میں یہ خیال راسخ کر دیا کہ ان کے اندر خدا حلول کر گیا ہے، مولانا نے خاندانوں اور افراد کی دینی وسیاسی اجارہ داری کے نتیجہ میں رونما ہونے والی گوناگوں خرابیوں کی نشاندہی کی ہے۔

مصنف نے بتایا ہے کہ جب اسلام کا دور دورہ ہوا تو اس وقت دنیا دو طرح کی موروثی اور خاندانی حکومتوں کے نظام میں جکڑی ہوئی تھی ایک تو مطلق العنان دنیوی حکومت تھی جو باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتی یا خاندان کے ایک فرد سے اس کی وصیت کے مطابق دوسرے فرد کو ملتی یا پھر کوئی اپنے زور وقوت سے اہلیت واستحقاق کے بغیر بھی اسے حاصل کر لیتا اس طرز حکومت میں ملک وقوم کے مفاد کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا بلکہ ملک کی ساری پیداوار اور آمدنی بادشاہوں کی ملکیت ہوتی اور وہ اس میں من مانا تصرف کرتے، اپنے خزانے مال ودولت سے بھر کر عیش کرتے، آمر و مطلق العنان حکمراں سب لوگوں سے بالاتر سمجھا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا کہ اس کی رگوں میں اللہ کا مقدس خون رواں ہے،

بادشاہوں کے مقابلہ میں رعیت کی حالت نہایت ابتر اور جانوروں سے بھی بدتر تھی، ان کی زندگی نہایت پُر مشقت اور سخت شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہوتی۔

دوسری حکومت روحانی ودینی تھی اس میں دینی اقتدار ایک مخصوص نسل وخاندان اور اس کی معین شاخ میں مرکوز ہو کر رہ گیا تھا اور دینی قیادت وسربراہی اس کی میراث وجاگیر بن گئی تھی اور دینی رہنما کا تقدیس کی حد تک احترام کیا جاتا تھا، اس کو گوناگوں اقتصادی فوائد حاصل تھے اور اپنی

خواہشات پوری کرنے کا ہر طرح کا اختیار تھا، وہ خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان واسطہ بنا ہوا تھا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال اور آزادی کے ساتھ ایک تازہ شریعت ایجاد کر سکتا تھا،

موروثی جاگیرداری کا یہ دینی ودنیاوی نظام یونان، ایران اور ہندوستان وغیرہ میں رائج تھا، اسلام نے اس کو ختم کر کے مسلمانوں، اہل شوریٰ اور اہل علم واخلاص کو خلیفہ کے انتخاب کا حق دیدیا اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی صراحت نہیں فرمائی کہ آپؐ کے بعد آپؐ کا جانشین کون ہوگا اگر یہ معاملہ واقعی آپؐ کے دینی فرائض میں شامل ہوتا تو آپؐ ضرور اس کی صراحت ووضاحت فرما دیتے اور اس کا نفاذ کر کے دنیا سے تشریف لے جاتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اے پیغمبر جو کچھ تم پر تمہارے خداوند کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو خدا کے پیغام کو نہیں پہنچایا وہ تم کو لوگوں سے بچائے گا" (مائدہ، ۶۷)

اس ضمن میں حدیث قرطاس سے استدلال کرنے والوں کو مولانا یہ جواب دیتے ہیں۔

"کاغذ طلب فرمانے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تین روز تک زندہ رہے مگر نہ کبھی کاغذ طلب فرمایا اور نہ خلافت کے متعلق کوئی تصریح کی جب کہ خود اسی روز اور اس کے بعد بھی دوسری بہت سی وصیتیں فرمائیں مگر خلافت کے بارے میں اشارۃً وصراحتاً کچھ ارشاد نہیں فرمایا" (ص ۴۳)

۲۔ مسئلہ خلافت میں خلفاء کی ترتیب بھی ما بہ النزاع ہے جسے ایک اتفاقی امر کہا جاتا ہے مگر مولانا کے نزدیک یہ الہامی اور تقدیری امر ہے جس میں خاص حکمت ربانی کارفرما ہے، وہ رقمطراز ہیں۔

"حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہ کوئی اتفاقی بات تھی اور نہ کسی سازش کا نتیجہ تھی بلکہ یہ غالب وحکمت والے خدا کی طرف سے ایک طے شدہ فیصلہ تھا اس نے مسلمانوں کی جمعیت کو باقی رکھنے اور اپنے دین کو غالب کرنے کا جو ارادہ کر لیا تھا یہ اس کے ساتھ لطف وکرم کا ایک معاملہ تھا" (ص ۵۰)

"حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب کی وجہ سے مسلمانوں کو اس خاندانی اور موروثی طرز حکومت سے

نجات مل گئی جس کی بنیاد خون کے تقدس اور نسبی شرف پر ہے، اگر پہلی مرتبہ خلیفہ کا انتخاب بنی ہاشم میں سے ہوا ہوتا جس کے وہ اہل تھے تو اس خاندان میں دینی و روحانی سربراہی کے ساتھ دنیاوی سلطنت کی بھی داغ بیل پڑ جاتی اور اسلام میں بھی عیسائیوں کی طرح پاپائیت کا سلسلہ قائم ہوجاتا اور اس کے وہی خراب اور برے نتائج دین کے متبعین اور اسلامی معاشرہ میں رونما ہوتے جن کا مشاہدہ مسیحی پاپائیت اور مجوسی و برہمنی نظام میں کیا جاسکتا ہے یعنی ایک ہی خاندان میں حکومت و سیادت مرکوز ہوجاتی، خودرائی اور استبدادیت کا مظاہرہ ہوتا، اقتصادی و معاشی استحصال شروع ہوجاتا اور آئندہ نسلیں خلفاء کے بارے میں یہ خیال کرنے لگتیں کہ وہ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہی نہیں بلکہ مافوق البشر ہیں جو لوگوں کی دولت حاصل کرکے دادِ عیش دیتے ان سے نذر و نیاز، ہدیے اور صدقے وصول کرکے زندگی بسر کرتے، یہ بات اس حکمت کے بھی خلاف ہے جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی ہاشم کے لیے زکوٰۃ لینے کو حرام قرار دیا ہے۔ اگر یہ دونوں طرح کی وجاہت یعنی دنیاوی حکومت اور دینی سربراہی بنی ہاشم کو وراثتاً مل جاتی تو پھر کبھی ان کے خاندان سے باہر نہ جاتی" (ص ۷۹ و ۸۰)

مولانا نے حضرت عمرؓ کے انتخاب کو بھی الہامی اور حکمت الٰہی کا مظہر بتایا ہے (ص ۹۸) مسئلہ کی مزید توضیح کے لیے یہ تنقیح بھی ملاحظہ کے لائق ہے۔

"اکثر انقلابی و اصلاحی تحریکوں کا آغاز تو اصلاحی دعوت اور فساد و ضلالت کی بیخ کنی سے ہوا مگر پھر دعوت کے اولین بانی اور انقلاب کے داعی کی نسل و خاندان میں حکومت و اقتدار یا سیاسی و فوجی قوت کے حصول پر ان کی انتہا ہوئی اسی لیے ذہین و حساس لوگوں کو دینی و دعوتی تحریکوں کی جانب سے ہمیشہ تشویش لاحق رہی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ہرقل نے ابوسفیان سے ایک سوال یہ کیا تھا

کہ کیا اس نبیؐ کے باپ دادا میں کوئی بادشاہ گذرا ہے، ابوسفیان نے جواب دیا نہیں، اسے سن کر ہرقل نے کہا اگر اس کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں کہتا کہ یہ شخص اپنے باپ دادا کا اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے،

ماحصل یہ خدائے عزیز و علیم کی حکمت ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے خاندان اور اہل بیت میں سے کوئی شخص آپؐ کا جانشین نہیں ہوا بلکہ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے جو بنی تیم میں سے تھے اور ان کے جانشین حضرت عمرؓ ہوئے اور یہ بنی عدی میں سے تھے، ان کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے جو بنی امیہ میں سے تھے، ان کے بعد حضرت علیؓ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی جب مسلمانوں اور صحابۂ کرام میں ان سے بہتر کوئی شخص نہیں تھا، اس ترتیب سے شکوک و شبہات ختم ہوگئے اور لوگوں کی زبانیں بند ہوگئیں، دراصل خلافت و امامت خاندانی و نسلی نہیں ہے بلکہ یہ صلاحیت و استعداد پر موقوف اور ایک تقدیری معاملہ ہے اس سے ہر قسم کے رد و قدح کا دروازہ مسدود ہوجاتا ہے وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (ص ۸۱)

مولانا کے نزدیک یہی طریقہ عربوں کے دستور کے مطابق بھی تھا، انگریزی کے مشہور اسلامی انشاپرداز اور ممتاز شیعی مصنف سید امیر علی رقمطراز ہیں:-

"سردار کے انتخاب میں عربوں میں موروثی اور نسلی اقتدار و سیادت کا رواج نہ تھا بلکہ اس کا دار و مدار انتخاب پر تھا، عام رائے دہندگی کے اصول کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی، قبیلہ کے تمام افراد کی آواز سے فائدہ اٹھایا جاتا اور اس پر عمل کیا جاتا تھا، متوفی کے بعد نرینہ افراد میں سے سن و سال اور فضیلت و برتری کی بنیاد پر انتخاب ہوتا تھا" (ص ۷۹)

یہ واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت علیؓ کی عمر ۳۳ برس اور حضرت ابوبکرؓ کی ۶۱ برس تھی۔ (ص [illegible])

۳۔ اسی ضمن میں مصنف المرتضیٰ نے یہ مسئلہ بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ شیخینؓ اور دوسرے اجلۂ صحابۂ کرام نے خلیفہ کے انتخاب میں تعجیل کیوں کی اور اسے تجہیز و تکفین کے کام پر مقدم کیوں رکھا، فرماتے ہیں:۔

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان ایک چوراہے پر کھڑے تھے اب دو ہی صورتیں رہ گئی تھیں یا تو اتحاد و یک جہتی سے اسلام کو پھیلانے میں لگ جاتے اور ایک ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے جس کی فضیلت و برتری کا اعتراف مسلمانوں کو تھا اور وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلعم کی نگاہ میں اس کا درجہ کتنا بلند تھا اور آپ نے انتہائی نازک مواقع پر اسے آگے بڑھا کر اس کے فضل و کمال پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے یا پھر دوسری صورت نزاع و جدال اور اختلاف فکر و رائے کی تھی جس میں مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہو جانے، شیرازہ ملت بکھر جانے کا اندیشہ اور اسلام کے مستقبل کو خطرہ لاحق تھا، اس طرح اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح سیادت و قیادت اور خلافت و امارت کے جھگڑوں میں پڑ کر اختلاف و انتشار کی بھینٹ چڑھ جاتا۔

مدینہ میں پیش آنے کی وجہ سے یہ معاملہ زیادہ پیچیدہ اور نازک بن گیا تھا جہاں قبیلۂ قحطان کی دو بڑی شاخوں اوس و خزرج کا وطن تھا، اپنے ایثار و قربانی اور دوسری گوناگوں خدمات کی وجہ سے خلافت کے لیے انصار کا اپنے کو بہتر سمجھنا ایک طبعی و معقول امر تھا، حضرت عمرؓ اس نفسیاتی پیچیدگی و دشواری کو بخوبی سمجھ گئے تھے جس کا سامنا مسلمانوں کو وفات نبویؐ کے بعد کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ وہ ذہانت و فطانت میں اپنے معاصرین سے بہت ممتاز تھے وہ جانتے تھے کہ اس معاملہ میں ایک روز کی تاخیر سے بھی اتفاق و اتحاد کی رسی ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گی جن پر اسلام کے مستقبل اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی

اور دین کی حفاظت کا دارومدار ہے۔ تو دوبارہ اتفاق و اتحاد قائم نہیں ہو سکتا اس لیے انھوں نے خلیفہ کے انتخاب میں عجلت فرمائی اور تاخیر گوارا نہیں کی" (ص ۷۶ و ۷۷)

عام خیال یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں حضرت علیؓ کو پس و پیش رہا مگر خود شیعی فاضل سید امیر علی کا بیان ہے

"حضرت ابوبکرؓ حکمت و دانشمندی اور اعتدال و توازن کی بنا پر خاص امتیاز رکھتے تھے اس لیے ان کے انتخاب کو حضرت علیؓ اور دوسرے اہل بیت نے اپنے موروثی اخلاص اور اسلام سے تعلق و وفاداری کی بنا پر مان لیا" (ص ۷۹)

۴۔ کسی خاص عقیدہ و خیال سے جذباتی وابستگی رکھنے والے جانبدار مورخین نے اس دور کی جو تصویر پیش کی ہے اس کی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کو خلفائے ثلاثہ سے اخلاص و الفت کے بجائے بغض و عناد تھا مگر اس طرح کی باتیں لکھنے والے اس پر غور نہیں کرتے کہ اس سے حضرت ابوبکرؓ کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اختیار رکھنے کے باوجود اپنے بدخواہ سے کوئی انتقام نہیں لیا، اس کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی اس سے تنقیص ظاہر ہوتی ہے، مولانا نے ان لوگوں کی رائے کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے

"حضرت علیؓ اپنی طبعی و خاندانی شرافت و نجابت اور اخلاص کی بنا پر زندگی بھر حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں ان سے تعاون فرماتے رہے، ان کے پورے بہی خواہ اور ہمدرد تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت و مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے بنفس نفیس ذو القصہ جا کر مرتدین سے جنگ اور ان کے خلاف فوجی کارروائی کی قیادت کرنی چاہی جو ایک پُرخطر اقدام تھا اور اس میں نہ صرف ان کی ذات کے لیے بلکہ پورے اسلامی وجود کیلیے خطرہ تھا تو حضرت علیؓ نے ان کی

اونٹنی کی مہار پکڑلی اور فرمایا اے خلیفۂ رسولؐ کہاں کا قصد ہے میں آپ سے وہی بات عرض کرنا چاہتا ہوں جو احد کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ اپنی تلوار نیام میں رکھو اور ہم کو اپنی جدائی کا صدمہ نہ دو اور مدینہ واپس جاؤ خدائے ذوالجلال کی قسم اگر آپ کا صدمہ ہمیں اٹھانا پڑا تو شیرازۂ اسلام ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہو جائے گا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ واپس ہو گئے، معاذ اللہ اگر حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے ان کا دل صاف نہ ہوتا اور علی الرغم انھوں نے بیعت کی ہوتی تو یہ ایک نہایت سنہرا موقع تھا جس سے وہ فائدہ اٹھاتے اور حضرت ابوبکرؓ کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے تاکہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا اور ان کا قصہ تمام ہو جاتا اور ہمیشہ کے لیے ان سے چھٹکارا مل جاتا، اگر واقعی حضرت علیؓ کو ان سے ناگواری ہوتی تو وہ کسی کو بھی آمادہ کرکے انہیں دھوکہ سے قتل کرا دیتے جیسا کہ اپنے دشمنوں کے معاملہ میں عام سیاسی لوگوں کا دستور ہے۔

اس واقعہ سے قطع نظر یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے ایسی محبت و مودت کا برتاؤ کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں جو خوشی و غم اور آرام و تکلیف میں شریک رہتے ہیں خود خاندان ہاشمی کے ایک سربرآوردہ شخص حضرت محمد باقر سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ کی کمر میں درد تھا تو حضرت علیؓ اپنا ہاتھ آگ پر گرم کرکے ان کی کمر سینکتے تھے" (ص ۸۹ و ۹۰)

حضرت عمرؓ سے گہرے تعلق و اخلاص اور مسلمانوں کے مفاد کو عزیز رکھنے کی بنا پر حضرت علیؓ نے انہیں روم پر حملہ کرنے سے منع کیا (ص ۱۰۶ و ۱۰۷) اور باغیوں نے جب حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کیا تو وہ اپنے صاحبزادوں کو لے کر ان کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔

۵۔ فاضل مصنف نے خلافت کی اہلیت و صلاحیت پر اچھی بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ

حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ اس وقت بارِ خلافت اٹھانے کا کوئی دوسرا شخص اہل نہیں تھا، ان کی بحث و تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے مسئلہ میں امت کے سوادِ اعظم کا موقف ہر اعتبار سے معقول و مناسب تھا، خلافت و امامت کے اس طرح کے پیچیدہ اور نازک مباحث کو حل کرکے مصنف نے وہی خدمت انجام دی ہے جو اپنے اپنے دور میں متکلمین انجام دیتے رہے ہیں۔

۶۔ مولانا نے اس کتاب کے دسویں باب میں واقعہ کربلا کے بعد اہل بیت کرام اور حضرت علیؓ کے اخلاف کی سیرت و کردار کے جو جلوے دکھائے ہیں اس سے ان حضرات کی پاکیزہ و بے داغ زندگی، بلند و برتر شخصیت، ہمت و اولوالعزمی شجاعت و بہادری، استقلال و استقامت کے لازوال نقوش اور اسلام کی دعوت و اشاعت اور نفوس کے اصلاح و تزکیہ کے عظیم الشان کارناموں کا مرقع سامنے آجاتا ہے، ان خدمات و کمالات کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"واقعات و حقائق کی روشنی میں ان حضرات کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ اس کے بالکل خلاف ہے جو ان کے غالی معتقدین پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں شجاعت و اظہارِ حق کی جرأت مفقود تھی اور وہ حوادث و خطرات سے ڈرے اور سہمے رہتے تھے، مصلحت و اخفائے حق کی سیاست پر عمل پیرا تھے، تقیہ اور مداہنت کو ڈھال بنائے ہوئے تھے اس سے وقتی اور ہنگامی ضرورت ہی کے وقت کام نہیں لیتے تھے بلکہ عبادت و تقرب الی اللہ کا مستقل وسیلہ بنائے ہوئے تھے اور جا و بیجا ہر موقع پر اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، امت کو نبوت کی اصل تعلیمات سے قریب نہیں ہونے دیتے تھے، دین کے غلبہ و سربلندی کا نہ ان میں جوش و ولولہ تھا اور نہ وہ اس راہ کی دشواریوں اور خطرات کا مقابلہ کر سکتے تھے ان ائمۂ عظام کے معتقدین نے اپنی کتابوں میں ان حضرات کے جو فضائل و مناقب قلم بند کیے ہیں وہ ماسونیت، جمعیۃ اخوان الصفا اور زیرِ زمین ان باطنی تنظیموں کی تصویروں کے مانند ہیں،

جواب بھی بعض ملکوں میں پائی جاتی ہیں" (ص ۲۳۱ و ۲۳۲)

۷۔ بعض امور کی حکمت و مصلحت بہت اچھے پیرایہ میں واضح کی گئی ہے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ سے آپؐ کی میراث کا مطالبہ کیا گیا تو انھوں نے آپؐ کا یہ قول پیش کیا کہ "ہم پیغمبروں کا گروہ کسی کو وارث نہیں بناتے، ہم نے جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے" مولانا اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان اور آپؐ کی زندگی بھر کے طرزِ عمل کے مطابق تھی، آپؐ نے اپنے گھر والوں اور بنی ہاشم کے افراد کو خطرے کی جگہوں اور ایثار و قربانی کے موقعوں پر آگے کیا مگر مالِ غنیمت اور منفعت حاصل کرنے کے وقت انہیں پیچھے کر دیا، بدر کے معرکہ میں حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کو عرب کے جنگ آزما بہادروں سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھایا، مگر بنی ہاشم کے لوگوں کے لیے صدقات و زکوٰۃ قبول کرنا حرام قرار دیدیا، حالانکہ یہ امت محمدیہ میں ہمیشہ آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس کی مثال کبھی نہ رکنے والے چشمہ جاری اور کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے کی ہے، جب سود کو حرام قرار دینے اور جاہلیت کے قدیم خون بہا کو معاف کر دینے کا ارادہ کیا تو اس کی ابتدا بھی اپنے ہی خاندان سے کی اور اپنے چچا حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کے سود اور اپنے بھتیجے ربیعہؓ بن حارث کے بیٹے کا خون بہا معاف کیا" (ص ۸۱ و ۸۲)

کتاب میں بعض چیزوں کی تحقیق میں کدوکاوش کی گئی ہے اور بعض واقعات کے صحیح زمانہ کا تعین کیا گیا ہے، اہم اور قابل غور باتوں کی نشاندہی کرکے ان کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے بعض جگہ مختلف اقوال و دلائل میں محاکمہ کرکے مرجح قول کی تعیین کی ہے یہ اور اس طرح کی گوناگوں خوبیوں کے باوجود اس میں بعض امور قابل توجہ ہیں۔

۱۔ کتاب میں بعض اہم اور ضروری بحثیں یا تو نظر انداز کر دی گئی ہیں یا ان کی بقدر ضرورت تفصیل نہیں دی گئی ہے مثلاً حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت کا بیان بہت مختصر ہے، مولانا نے خود لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں مختلف روایتیں ہیں مگر انھوں نے صرف حضرت ابو سعید خدریؓ کی ایک روایت نقل کرکے ابن کثیرؒ کے حوالہ سے اس قدر لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے پہلے ہی دن بیعت کی ہے یا وفات کے دوسرے روز اور یہی حقیقت امر ہے، مولانا کے خیال میں چھ ماہ بعد برسرعام بیعت کرنے کی روایت مرجوح ہے، ابن کثیرؒ اور دوسرے اہل علم نے اس رجحان کی تائید کی ہے کہ دوسری بیعت پہلی بیعت کی توثیق و تجدید تھی، ہماری ناچیز رائے میں اس نازک اور تفصیل طلب بحث کا حق مولانا کے ان مجمل اشارات سے ادا نہیں ہو سکا، اس سلسلہ کی تمام روایتوں پر نقد و تبصرہ کرکے صحیح فیصلہ اور درست نتیجہ بیان کرنا چاہیے تھا۔

اسی طرح باغ فدک اور اراضی خیبر کے سلسلہ میں محتاط انداز میں جو بحث کی گئی ہے اس سے مسئلہ کی وضاحت اور روایات پر تحقیق و تنقید کا حق خاطر خواہ طور پر ادا نہیں ہوا ہے، مصنف مدظلہ نے عموماً دامن بچا کر سرسری گذر گئے ہیں، انکے نزدیک فریقین مجتہد تھے اس لیے دونوں مصیب تھے مگر بحث و تحقیق کا یہ طریقہ علمی و معروضی نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کی ازواج و اولاد کا تذکرہ بھی بہت مختصر اور ناکافی ہے اس سے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ دوسری بیویوں اور ان کی اولاد کے نام اور تعداد کا بھی پتہ نہیں چلتا، ایک طرف تو مولانا حضرت علیؓ کی نسل کے دور آخر تک کے لوگوں کے ولولہ انگیز کارنامے بیان کرتے ہیں لیکن دوسری طرف خود ان کی اولاد کے حالات اور پُرفخر کارنامے بیان کرنے سے بھی اغماض برت رہے ہیں۔

امیر المومنین کے فضائل و مناقب کا حصہ بھی مزید تفصیل کا متقاضی تھا اور اس کے لیے احادیث کو بنیاد بنانے کی ضرورت تھی، اس سلسلہ میں مصنف کے عقیدت مندوں کو ان کے حقیقت نگار

قلم سے فضائل کی ضعیف و موضوع روایتوں پر نقد و تبصرہ دیکھنے کا بھی اشتیاق تھا، حضرت علیؓ کے علمی کمالات میں محض نہج البلاغہ سے چند حکیمانہ اور بلیغ اقوال جمع کر دینا کافی سمجھا گیا ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت اقضاھم علی ہے نیز فقہ و افتا اور اجتہاد میں ان کا درجہ نہایت بلند تھا تفسیر و حدیث میں بھی ان کی بلند پایگی مسلّم ہے مگر المرتضیٰ ان کے ان عظیم الشان علمی و دینی کارناموں کے ذکر سے خالی ہے، ان سے مروی روایتوں کی تعداد تک کا ذکر نہیں آنے پایا ہے،

شیرِ خدا کی سیرت و شخصیت کے بعض اور اہم پہلو بھی زیادہ نمایاں نہیں ہو سکے ہیں جیسے ان کے اخلاق و عادات ان کی معاشرتی اور خانگی زندگی اور اپنے مخالفین کے ساتھ برتاؤ کی تفصیل کماحقہ مذکور نہیں ہے، اگر اس کی مزید تفصیل ہوتی تو یہ بڑی مؤثر اور سبق آموز ہوتی اور اس سے موجودہ دور میں بھی بڑی رہنمائی ملتی۔

۲۔ تفصیل سے گریز اور اختصار پسندی کی وجہ سے مصنف نے احادیث اور تاریخی واقعات پر بقدر ضرورت بحث و تبصرہ نہیں کیا ہے مثلاً ص۵۳ پر غدیر خم کے موقع پر آپؐ کے خطبہ کی جو حدیث نقل کی ہے وہ چاہے موضوع اور سراسر ضعیف نہ ہو مگر بعض محدثین نے اس پر کلام ضرور کیا ہے، اسی طرح حضرت طلحہؓ کی شہادت سے متعلق جو روایتیں درج ہیں (ص۱۴۶) وہ بھی بحث و تنقید کی محتاج ہیں اس میں حضرت طلحہؓ کے مروان کے تیر کا نشانہ ہو جانے کی جو روایت صیغہ مجہول سے نقل کی گئی ہے اس سے خود ظاہر ہے کہ یہ پایہ ثبوت سے گری ہوئی ہے۔ اس لئے اسے تحریر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

۳۔ مصنف نے بعض واقعات و حالات خصوصاً نازک امور کے بیان میں صرف ایک ہی دو کتابوں پر اعتماد کر لیا ہے اس کی وجہ سے واقعات کی یک رخی تصویر ہی سامنے آتی ہے، مثلاً حضرت ابو بکرؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت اور یزید کی ولی عہدی کے ذکر میں محض البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) کو اور واقعہ کربلا میں صرف اصابہ (ابن حجر) کو ماخذ بنایا ہے، یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جن واقعات

و حالات کی تفصیل خود کتب حدیث میں موجود ہے ان کے لیے سیر و طبقات اور تاریخ کی کتابوں کا حوالہ دینا کیوں پسند کیا گیا مثلاً ام ہانی (ص۳۰) حاطب بن ابی بلتعہ (ص۵) اور غدیر خم (ص۵۳) وغیرہ

اسی طرح بعض جگہ سیر و تاریخ کی قدیم اور اہم کتابوں کا حوالہ نہ دے کر دور حاضر کے مصری فضلا و مصنفین کی کتابوں کو ماخذ و مرجع بنایا ہے، دار المصنفین سے مولانا کا جو گہرا تعلق رہا ہے اور ہے اس کے باوجود پتہ نہیں کیوں اس کی کتابوں کے حوالے المرتضیٰ میں نہیں دیے ہیں جبکہ وہ تحقیق و استناد میں مصری فضلا کی تصانیف سے کمتر نہیں ہیں۔

۴۔ بعض جگہ مختلف اقوال میں ترجیح و محاکمہ نہ کرنے کی وجہ سے پتہ نہیں چلتا کہ مصنف کے نزدیک صحیح و صواب کیا ہے مثلاً حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

"فتح مکہ اور حنین میں ان کی شرکت کا ذکر نہیں ملتا، وہ بیمار تھے، ابن سعد نے اس کی جانب اشارہ کیا ہے لیکن زبیر بن بکار نے حضرت حسن بن علی سے روایت کی ہے کہ وہ ان لوگوں میں ہیں جو غزوہ حنین میں ثابت قدم رہے"

۵۔ اختصار کے مقابلہ میں کہیں کہیں غیر ضروری تفصیل بھی ہے مثلاً حضرت علیؓ کے تعلق سے خلفائے ثلاثہ کا ذکر ناگزیر تھا مگر حضرت علیؓ کے مخصوص تذکرہ میں ان حضرات کی خصوصیات، فضائل و مناقب اور ان کے دور خلافت کے ان واقعات کا ذکر بے محل سمجھا جائے گا جن سے براہ راست حضرت علیؓ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

۶۔ کہیں کہیں فروگذاشتیں بھی ہو گئی ہیں مثلاً ص۔۔ پر لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو سقیفہ بنی ساعدہ میں اس لیے جمع کیا کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے، واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد منافقین کی سازش سے انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے تھے، جب حضرت ابو بکرؓ کو اس ہنگامہ آرائی کا پتہ چلا تو وہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو لے کر وہاں پہنچے،

اور اپنے تدبر سے معاملہ کو سلجھایا۔

مصنف کے بیان کے مطابق حضرت عثمانؓ کی شہادت جمعہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو ہوئی (ص ۱۳۵) اور ص ۱۳۹ پر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد پانچ دنوں تک اہل مدینہ اور اس کے امیر غافقی بن حرب کو انتظار رہا کہ خلافت کی ذمہ داری کون سنبھالتا ہے مگر اسی صفحہ پر اس کے بعد یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ کی بیعت شنبہ ۱۹ ذی الحجہ ۳۵ھ کو ہوئی، ایسی صورت میں پانچ دنوں تک انتظار کی بات کیسے درست ہو سکتی ہے۔

حاشیہ ص ۱۶۹ و ص ۱۷۰ پر نہج البلاغۃ کے جامع شریف رضی کا زمانہ (۳۵۹-۴۰۴ھ) تحریر ہے، آگے نہج البلاغۃ کے متعلق ابن سیرینؒ کا قول نقل کیا ہے حالانکہ محمد بن سیرینؒ امام حسن بصریؒ کے معاصر و رفیق اور مشہور تابعی تھے، ان کا انتقال ۱۱۰ھ میں ہوا، اس طرح ان کے اور شریف رضی کے زمانہ میں صدیوں کا تفاوت ہے، ایسی صورت میں وہ نہج البلاغۃ کے متعلق کس طرح اظہار خیال فرما سکتے ہیں، اگر ابن سیرین سے کوئی اور بزرگ مراد ہیں تو اس کی صراحت ضروری تھی،

حضرت حسینؓ کی ولادت کا ماہ و سال شعبان ۴ھ لکھا ہے (ص ۲۰۳) آگے فرماتے ہیں کہ "ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے پانچ برس ملے" جب آپؐ کی وفات ۱۱ھ میں ہوئی اور صحیح قول کے مطابق حضرت حسینؓ ۴ھ میں پیدا ہوئے تو آپؐ کی زندگی کے پانچ برس ملنے کی بات صحیح نہیں ہو سکتی۔

۷۔ عبدالمطلب کے تذکرہ میں ابرہہ کے واقعہ کا ذکر ہے (ص ۱۹) اور لکھا ہے کہ بیت اللہ سے تعلق اور وابستگی کی بنا پر عبدالمطلب ہی مکہ اور بیت اللہ کے معاملات میں گفتگو کرنے کی غرض سے ابرہہ کے پاس گئے، اس نے ان کی وجاہت کی بنا پر ان کا بڑا اعزاز کیا اور ان کی آمد کا سبب دریافت کیا، عبدالمطلب نے اس سے دو سو اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جو اس کے سپاہی بھگا لے گئے تھے، سوال یہ ہے کہ مولانا کے بقول وہ "شئون مکہ و البیت" کے بارے میں گفتگو کرنے گئے تھے تو یہ غیر متعلق گفتگو کیوں کی اور اصل موضوع

پر بات کرنے سے گریز کیوں کیا، مولانا ہی کے بیان کے مطابق عبدالمطلب کی یہ گفتگو سن کر اس کی نگاہ میں ان کی قدر و قیمت بہت کم ہو گئی اور اس نے نہایت تعجب سے پوچھا کہ تم کو اپنے اونٹوں کی فکر ہے اور کعبہ کی کوئی پروا نہیں جو تمہارا دین و ایمان ہے، ابرہہ کے عار دلانے پر انہوں نے فرمایا کہ "میں اونٹوں کا مالک ہوں اور کعبہ کا بھی ایک مالک ہے، وہی اس کو بچائے گا" مولانا کے نزدیک عبدالمطلب کے بیان سے ان کے اس یقین و اذعان کا پتہ چلتا ہے کہ اس گھر کی عظمت خدا کی نگاہ میں ہے اس لیے وہی اس کی حمایت و حفاظت کرے گا،

یہ عجیب بات ہے کہ جو گھر اللہ کے نزدیک اتنا مقدس و محترم ہو اور جس کو نہ صرف عبدالمطلب بلکہ پورا قبیلہ قریش اور اہل مکہ بھی نہایت محبوب رکھتے تھے اور اس پر جانیں چھڑکتے تھے اور جس کی بدولت عبدالمطلب اپنی قوم میں معزز اور سربرآوردہ خیال کیے جاتے تھے مگر جب اسے ڈھا دینے کے لیے ابرہہ اپنے لاؤ لشکر سمیت حملہ آور ہوا تو عبدالمطلب کے اندر کوئی غیرت و حمیت اور جوش و ولولہ پیدا نہیں ہوا اور انہوں نے اس کی مدافعت تو درکنار اس کے مسئلہ پر ابرہہ سے کوئی بات چیت بھی نہیں کی جس کے لیے وہ بقول مصنف اس کے پاس گئے تھے۔

اس معاملہ پر اس حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر آج کچھ بدبخت لوگ خانہ کعبہ کی حرمت و تقدس کو پامال کرنے کے لیے اٹھیں اور حرم میں خلفشار برپا کریں تو کیا اہل ایمان کو عبدالمطلب جیسا جواب دے کر بیٹھ رہنا چاہیے، اگر یہی بات ہے تو دو برس قبل حرم میں رونما ہونے والے واقعات پر احتجاج کرنے کی کیا ضرورت تھی اور کیوں تحفظ حرم کے لیے مسلمانوں نے کانفرنسیں اور جلسے کیے؟

۸۔ مولانا نے کتاب کے دسویں باب میں اہل بیت اور حضرت علیؓ کی اولاد و احفاد کی پاکیزہ سیرت اور دعوت اسلامی کے فروغ میں ان کے کارنامے بیان کیے ہیں مگر اس طرح کی اسلامی خدمات دوسری نسل و خاندان کے لوگوں بلکہ عجمیوں نے بھی انجام دی ہیں، کتاب کے شروع میں نسلی و خاندانی اثرات کا

ذکر ضرور ہے مگر مصنف کے بیان کے مطابق یہ اصول وکلیہ نہیں ہے، اس تحریر میں فاضل مصنف کے حوالہ سے ان خرابیوں اور تباہیوں کا ذکر آچکا ہے جو نسلی وخاندانی اجارہ داری کے نتیجہ میں ظاہر ہوئیں، اس لیے مولانا کی یہ تصویر یک رخی ہے اور اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰؐ خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است

مسلمانوں کا ایک طبقہ جو سواد اعظم سے جدا ہوا اس میں بڑی تعداد سادات اور اہل بیت ہی کی ہے جن کے عقائد وافکار کو مولانا نے اسلام کی تصویر سے مختلف ومتضاد بتایا ہے۔

۹۔ ترجمہ میں بھی زیادہ احتیاط نہیں کی گئی ہے اور وہ کہیں کہیں اصل سے مختلف ہے ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہو، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حاشیہ ص۱۸ وص۱۹ میں بلوغ الادب فی معرفۃ احوال العرب کا حوالہ ہے اردو ترجمہ میں اس کا نام بلوغ الراہر فی معرفۃ احوال العرب لکھا ہے (ص۳۰ و ۳۴) انڈکس اردو (ص۴۵۱) میں بھی یہی غلطی ہے، ص۲۷ پر فاکہی کی کتاب مکہ کا ذکر ہے، اردو میں اسے الفاکمی لکھا ہے (ص۴۲) اور اشاریہ نگار نے اسے غلام محمد الفاکمی بنا دیا ہے (ص۴۴۳)

عبید اللہ بن زیاد بن سمیہ کو مجہول النسب لکھنا (ص۲۴) محل نظر ہے، رہے زیاد بن سمیہ تو ان کا بھی حضرت امیر معاویہؓ نے استلحاق کر لیا تھا، مترجم نے ابن زیاد کو صرف زیاد لکھا ہے (ص۴۲)

حاشیہ ص۱۰ پر مصنف نے احمد بن حسن زیات کا جو بیان نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہج البلاغہ کا زیادہ حصہ منحول اور شریف رضی کی اختراع ہے، اس نے ان تمام باتوں کو جو حضرت علیؓ سے منسوب کی گئی ہیں اس میں جمع کر دیا ہے، اس طرح اس میں صحیح کے ساتھ ممزوج اور آمیزش بھی ہے،

اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ "اس مجموعہ میں بہت کچھ حضرت علیؓ کا کلام ہے اور زیادہ حصہ ان سے منسوب کیا گیا ہے" (ص ۲۸۷) گویا مولف کے نزدیک نہج البلاغہ کا بہت کچھ حصہ منحول اور شریف رضی کا طبعزاد ہے اور مترجم کے نزدیک بہت کچھ حصہ حضرت علیؓ کا کلام اور ان سے منسوب ہے۔

مصنف نے بعض کبار صحابہ کے ناموں کی فہرست میں مروان کا نام بھی لکھا ہے (ص۱۳۳) مترجم نے بشمول مروان ان سب کو جلیل القدر صحابہ بتایا ہے (ص۲۲۹) جلیل القدر ہونا تو درکنار مروان کا صحابی ہونا بھی مسلم نہیں ہے۔

کتاب عربی واردو کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے، مضامین کی فہرست کے علاوہ کئی اشاریے بھی دیے گئے ہیں اور اس سے نہ صرف صاحب سوانح کے حالات وکمالات کا مرقع سامنے آگیا ہے بلکہ چاروں خلفاء کی عظمت اور خلافت وامامت کے مسئلہ میں صحیح وصائب اسلامی نقطۂ نظر بھی پوری طرح واضح ہو گیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب بے مثال اور علم کلام کی اساس بھی ہے ایک جگہ چاروں خلفاء کی عظمت اور خلافت راشدہ کی حقیقت پر بڑی مفید ومتوازن بحث کی ہے اسی کے ایک اقتباس پر یہ تبصرہ ختم کیا جاتا ہے۔

"میرے نزدیک یہ چاروں حضرات فرداً فرداً خلافت نبوتی کا مظہر اتم اور مصداق کامل تھے، ذاتی فضائل ومناقب اور ان کی بنا پر تفاوت درجات کو الگ کرکے خلافت کا مزاج اور اس کی روح ان میں سے ہر ایک میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی، خلافت راشدہ کیا ہے، خلافت راشدہ نہ اسلامی مملکت کی وسعت کا نام ہے نہ کثرت فتوحات کا، نہ کامیابیوں کے تسلسل کا، اگر معیار یہی ہو تو پھر ولید بن عبد الملک اور ہارون الرشید کو سب سے بڑا خلیفہ راشد ماننا پڑے گا۔ خلافت راشدہ نام ہے نبیؐ کے مزاج اور طرز زندگی میں نیابت کاملہ کا" (ص۴۲۵ اردو)

"ض"

مطبوعات جدیدہ

امیر خسرو ایز اے ہسٹورین AMIR KHUSRO AS A HISTORIAN

پروفیسر ایس، ایچ عسکری، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۷، مجلد قیمت ۲۵ روپیے، پتہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ۔

حضرت امیر خسروؒ کے اوصاف و کمالات متنوع اور گوناگوں ہیں، شاعری کی وجہ سے ان کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی، بقول علامہ شبلیؒ خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے، اردو میں ان پر بڑا کام ہو چکا ہے اور انگریزی زبان میں بھی ان پر محققانہ کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں، اس سلسلہ میں پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر پیٹر ہارڈی، ایس بی نگم، سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، ڈاکٹر وحید مرزا کی تصنیف بہت قابل قدر خیال کی جاتی ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو مشہور مورخ و محقق جناب سید حسن عسکری کے آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے، یہ مقالے وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے اور ان میں مورخ صفت باکمال شاعر کی تاریخ نگاری پر بحث کی گئی ہے، مقالات کی اہمیت کا اندازہ ان کے عنوان ہی سے ہوتا ہے، امیر خسرو بحیثیت مورخ، امیر خسرو بحیثیت سماجی مورخ، امیر خسرو کی تحریریں، سماجی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے، رسائل الاعجاز میں حالات زمانہ کی مرقع نگاری، رسائل الاعجاز کے سیاسی اور اقتصادی گوشے، اعجاز خسروی میں تاریخی دلچسپی کا مواد، رسائل الاعجاز ایک جائزہ اور امیر خسرو اور موسیقی، پہلا مقالہ خاص طور پر اہم اور پوری کتاب کی روح ہے، پروفیسر عسکری کے خیال میں امیر خسرو کی زندگی، مذہب

فنون لطیفہ، ادب، تلاش حسن اور جائز کسب معاش سے عبارت ہے، تاریخ نویسی ان کا اصل موضوع نہیں تھا، لیکن اپنی حساس طبیعت، دقت نظر اور علم و بصیرت کی وجہ سے وہ واقعات کو مربوط و منظم انداز میں سلیقہ سے پیش کرتے اور ان کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہیں، لائق مصنف نے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی سے بعض جگہوں پر ان کا موازنہ اسی حیثیت سے کیا ہے (ص ۹، ۱۰، ۱۱) اور دکھایا ہے کہ واقعات کی ترتیب و توقیت میں امیر خسرو کی روایتیں برنی کے مقابلہ میں زیادہ مستند ہیں، پروفیسر عسکری نے بجا طور پر مقالہ کا اختتام اس پر کیا ہے کہ امیر خسرو کے تاریخی ادب کی اہمیت کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، دوسرے مقالوں کا زیادہ حصہ رسائل الاعجاز سے متعلق ہے، رسائل الاعجاز (۵ جلدیں) کی ضخامت اور اس کی پرشکوہ، ذومعنی اور دقیق طرز نگارش کی وجہ سے خسرویات کے محققین نے اس سے صرف نظر کیا ہے، لیکن اس میں جو اہم مذہبی اور معاشرتی معلومات ہیں ان کی وجہ سے یہ ضروری تھا کہ اس کتاب کا بالاستیعاب، دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے، پروفیسر عسکری نے بڑی ژرف نگاہی سے اس پر توجہ دی اور اس کی مدد سے ہندوستان کے ملوک و امراء، تہذیب و ثقافت، عوام کی معاشرت، صنعت و حرفت، مختلف مذاہب، طبقاتی امتیاز، موسم، تیوہار، رسم و رواج اور زبان کے علاوہ کھانوں، پھلوں، لباس و زیورات، عوام کی تفریحات وغیرہ کے متعلق مفید معلومات پیش کیے ہیں اور جو کچھ اس میں تحریر کیا ہے، اس سے اس عہد کی تاریخ کا مکمل مرقع سامنے آجاتا ہے، رسائل الاعجاز کی تاریخ تصنیف کے تعین میں انھوں نے مدلل طور سے ڈاکٹر وحید مرزا کی رائے سے اختلاف کیا ہے (ص ۱۳۲) ص ۱۳۶ پر کمپوزنگ کی غلطی سے 13TH CENTURY کے بجائے 13TH COUNTRY چھپ گیا ہے، مجموعی اعتبار سے یہ کتاب صرف انگریزی ہی میں نہیں بلکہ خسرویات کے ذخیرہ میں ایک مفید اضافہ ہے اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اس مفید کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے۔

اسٹڈیز ان اسلام فار چلڈرن STUDIES IN ISLAM FOR CHILDREN

مولوی عبدالعزیز ایم اے، تقطیع کلاں، کاغذ، طباعت، نہایت نفیس، قیمت درج نہیں پتہ:

دی انڈین اصلاحی سنٹر پوسٹ بکس نمبر ۲۳۵، دبئی یو اے ای۔

مسلمان بچوں کے تعلیمی نصاب کے لیے جدید اصول تعلیم کے مطابق، انگریزی میں مفید کتابیں مرتب کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے زیر نظر کتابوں کا سٹ ابتدائی اول سے آٹھویں درجہ تک کے طلبہ کے لیے تیار کیا گیا ہے، ان میں بچوں کی عمر اور ذہنی استعداد کے لحاظ سے بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے قرآن مجید کی آخری سورتوں کے ترجمے اور اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات درج ہیں، چنانچہ انبیاء، ملائکہ، صحابہ، ازواج مطہرات کے متعلق آسان اور سہل زبان میں معلومات پیش کیے گئے ہیں، ہر سبق کے بعد مشق کے لیے سوالات بھی دیے گئے ہیں، کتاب کے شروع میں شیخ عبدالبدیع صقر اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تحسین آمیز کلمات بھی درج ہیں، مرتب نے مولانا ندوی کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا ہے کہ ان کی توجہ سے یہ کتاب طبع ہو سکی، یہ مفید دینی خدمت تحسین و آفریں کی مستحق ہے اور دینی تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے، دین سے کم واقفیت رکھنے والے انگریزی خواں طبقہ کے لیے بھی اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اسلام اینڈ نان وائلینس ISLAM AND NON VOILENCE! مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، مترجم بدر عظیم آبادی کاغذ طباعت مناسب صفحات ۳۱ قیمت درج نہیں

پتہ: ابو ہشام، جامعہ سلفیہ۔ ریوڑی تالاب وارانسی۔

مولانا صفی الرحمٰن سابق ایڈیٹر مجلہ محدث بنارس نے گاندھین انسٹی ٹیوٹ بنارس کی دعوت پر اسلام اور عدم تشدد پر ایک لکچر دیا تھا یہ رسالہ اسی کا انگریزی ترجمہ ہے اور اپنی عمدہ بحث کی وجہ سے قابل مطالعہ ہے۔

"ع۔ ص"